قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلیفون

87 92 46

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ

۴

چار روپے

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۴۸ روپے

غیر ممالک ——— ۱۱۰ روپے

جلد (۴۱) — جولائی ۱۹۸۸ء — نمبر (۷)

فہرست

۱- لمعات	
نفاذِ شریعت آرڈی ننس قرآنِ کریم کے آئینہ میں!	۲
۲- مہجور	۱۰
۳- کتاب و سنت کی صحیح پوزیشن (بہ سلسلۂ آئین سازی)	۱۱
۳- باب المراسلات	۵۶
(i) اسلام کونسا اسلام	
(ii) قصہ ہاتھی والوں کا	
۴- رابطۂ باہمی	۶۵
۵- متن نفاذِ شریعت آرڈی ننس اردو	۶۷
اور انگریزی	۷۲

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۴/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

لمعات

نفاذِ شریعت آرڈیننس ۱۹۸۸ء قرآنِ کریم کے آئینہ میں!

محترم صدرِ مملکت نے، نفاذِ شریعت آرڈیننس نافذ کرنے کے سلسلہ میں، قوم سے خطاب کے پہلے سورۃ الشوریٰ کی مندرجہ ذیل آیات تلاوت کیں۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ○ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ○ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ ...... (۴۲/۱۳-۱۵)

ان آیاتِ جلیلہ میں جن اہم امور کا حکم دیا گیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ کا مقرر کردہ دین وہ ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کیا گیا۔ یہ وہی دین ہے جو آپؐ سے پہلے انبیاءؑ کے لئے بھی مقرر کیا گیا تھا۔

۲۔ اِنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ ا کہ اللہ کے دین کو نافذ کیا جائے۔

۳۔ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ا اس میں تفرقہ نہ ڈالا جائے (فرقے اور پارٹیاں نہ بنائی جائیں۔

۴۔ آپؐ سے کہا گیا ہے کہ جس چیز کی طرف آپؐ انہیں دعوت دیتے ہیں۔ یعنی وحی کے مطابق دین کا قیام۔ وہ مشرکین (دین میں مختلف فرقے بنانے والوں ۳۰/۳۲) کو گراں گذرتی ہے۔

۵ وحی آجانے کے بعد، فرقوں کی بنیاد، باہمی ضد اور سرکشی (یعنی اپنے اپنے فرقے کے طریقے

پر پابند رہنے کی شدید خواہش) ہے۔

۶۔ جو لوگ اللہ کے بتائے ہوئے دین میں فرقے بناتے ہیں اور انہیں قائم رکھنے پر بضد ہیں، اگر اللہ نے اپنے قانون کے مطابق انہیں اصلاح کے لئے تفصیل (وقفۂ مہلت) نہ دی ہوتی تو ان کا کام تمام ہو جاتا۔

۷۔ وحیٔ خداوندی آجانے کے بعد، جو لوگ وارثِ کتاب ٹھہرے (جن میں ہم بھی شامل ہیں) انہوں نے دین کے بارے میں شکوک و شبہات کو اپنے دلوں میں جگہ دی جس سے انکے سینے وقفِ اضطراب رہتے ہیں۔ لیکن

۸۔ آپ کو اللہ نے یہ حکم دیا کہ استقامت کے ساتھ یہی دعوت عام کرتے رہیں کہ دین، صرف وحیٔ خداوندی پر مبنی ہوتا ہے۔

۹۔ آپ کو اللہ کی وحی کے خلاف لوگوں کی مفاد پرستانہ خواہشات کی پیروی نہیں کرنا چاہیے اور یہ کہنا چاہیے کہ میں تو اس پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور جو اس کتاب (قرآن کریم) میں ہے۔

۱۰۔ اور یہ کہ مجھے اسی کے مطابق عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہیں۔ اللہ وہ ہے جو سب کا نشوونما دینے والا ہے۔

پیشتر اس کے کہ مندرجہ بالا قرآنی احکامات کی روشنی میں شریعت آرڈیننس کا تجزیہ کریں، ہم بتاتے چلیں کہ مروجہ اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے ایک چیز ہے 'الدین' اور دوسری چیز ہے الشریعہ۔

الدین، ان غیر متبدّل اصولوں اور مستقل اقدار کو کہیں گے جو ضابطۂ خداوندی (قرآن کریم) میں مرقوم ہیں اور۔

الشریعہ، ان جزئی اور تفصیلی احکام کو جو ان اصولوں کے تابع وضع کئے جائیں۔ اصولِ دین ہمیشہ سے ایک رہے ہیں وہ ہر نبیؑ کی وساطت سے ہر قوم کو دیئے جاتے رہے۔ ان میں شروع سے آخر تک کوئی فرق نہیں ہوا۔ لیکن الدین پر چلنے کے طور طریقے، مختلف زمانوں میں اور مختلف اقوام و ممالک کے احوال و ظروف کے مطابق مختلف ہوتے رہے۔ اب جو کچھ قرآنِ کریم میں آگیا ہے۔ خواہ وہ اصولِ دین ہوں یا احکام۔ وہ سب غیر متبدّل ہے۔ لیکن جن اصولوں کی جزئیات خدا نے خود متعین نہیں کیں، (اور ایسا خدا نے دانستہ نہیں کیا کیونکہ ان جزئیات کو غیر متبدّل رکھنا مقصود نہیں تھا)۔ انہیں اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت) خود متعین کرے گی۔ انہیں احکامِ شریعت کہا جائے گا۔ اصول غیر متبدّل رہیں گے ان جزئیات (شریعت) میں حسبِ اقتضائے زمانہ تبدیلیاں ہو سکیں گی۔

اس ضروری وضاحت کے بعد، آیئے دیکھیں کہ صدرِ مملکت کا نافذ کردہ شریعت آرڈیننس، کس

طرح قرآنِ کریم کے بیان کردہ، مندرجہ بالا احکامات میں سے ایک ایک سے متصادم اور متخالف ہے۔

نکات ۱، ۲ اور ۳ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کا مقرر کردہ دین وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کیا گیا۔ یہ وہی الدین ہے جو آپؐ سے پہلے انبیاءِ کرام نوحؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے لئے بھی مقرر کیا گیا تھا۔ اور اللہ کے اسی دین کو نافذ کیا جائے اور اس میں تفرقہ نہ ڈالا جائے (فرقے اور پارٹیاں نہ بنائی جائیں)

جبکہ شریعت آرڈی ننس کے مطابق شریعت سے اسلام کے وہ احکام مراد ہیں جو قرآنِ پاک اور سنّت میں مرقوم ہیں۔ اس تشریح کے ساتھ جیسا کہ دستور کی آرٹیکل ۲۲۷ میں مرقوم ہے کہ کسی مسلم فرقہ کے کسی شخصی قانون کے ضمن میں شریعت کی تشریح اور تعبیر میں قرآنِ پاک اور سنّت کے الفاظ سے مراد، اُس مسلم فرقہ کے مطابق قرآنِ پاک اور سنّت کی تشریح اور تعبیر ہو گی۔

ملاحظہ فرمائیے کہ اب صورت کیا ہوئی؟

۱۔ اللہ نے کہا کہ وہ الدین، نافذ کرو جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ کتاب میں ہے اور

شریعت آرڈی ننس کے ذریعے اس الدین **یعنی غیر متبدل اصول و احکام اور مستقل اقدار** کے نفاذ کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ **صرف اس کے ذریعے** وہ جزئی اور تفصیلی احکام نافذ کرنے کی بات کی گئی ہے **جو الدین کے غیر متبدل** اصول و احکام اور مستقل اقدار کے تحت وقتاً فوقتاً مرتب ہوتے ہیں اور جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ قرآن پاک اور سنّت میں مرقوم ہیں۔

قرآن پاک اور سنّت میں مرقوم ہیں، کی شرط پر غور کرنے سے یہ صورت سامنے آتی ہے:

جب ہم قرآن کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو ہر مسلمان فوراً سمجھ لیتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس سے مراد ایک کتاب ہے جس میں الحمد سے والناس تک جو کچھ لکھا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف **وحی** کے ذریعے نازل کیا تھا اور وہ لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً ہم تک محفوظ شکل میں پہنچا ہے۔ اس کے زیر زبر تک میں کسی کو اختلاف نہیں لہٰذا جب ہم کہیں کہ شریعت سے اسلام کے وہ احکام مراد ہیں جو قرآنِ پاک میں مرقوم ہیں تو یہ بات بڑی متعین اور واضح ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں۔ اور اسے یقیناً آئین کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن کیا سنّت کی بھی یہی کیفیت ہے۔؟ جب ہم سنّت کا لفظ بولتے ہیں تو کیا اس سے ہر مسلمان کا ذہن کسی خاص کتاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے متعلق اس کا ایمان ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ سنّت ہے؟ اور کیا اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک قرآن کے متن کی طرح متفق علیہ اور تنقید

کی حد سے بالا ہے؟ اس سوال کا جواب پہلے آپ خود اپنے دل سے مانگئے اور دیکھئے کہ کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسی کتاب آتی ہے جسے آپ سنّتِ رسول اللہ کا اسی طرح مستند مجموعہ سمجھتے ہوں جس طرح قرآن کریم کو وحیٔ خداوندی کا مجموعہ سمجھتے ہیں؟ اس کے بعد آپ ان علمائے کرام اور ماہرین قانون سے دریافت کیجئے جنہوں نے شریعت آرڈیننس تیار کیا ہے کہ کیا وہ کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر سکتے ہیں جو تمام علماء اُمّت کے نزدیک تو ایک طرف، ان اصحاب کے اپنے نزدیک متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ یہ حضرات آپس میں متفق نہیں کہ سنّت کسے کہتے ہیں؟

لہٰذا جب قرآن کے ساتھ سنّت کو اسلامی احکام کا منبع قرار دیا جائے گا تو بات اُلجھ کر رہ جائے گی۔ عملی طور پر ایسی دشواریاں سامنے آئیں گی جن کے پیشِ نظر کوئی ایسا قانون نہیں بن سکے گا جو پرسنل یعنی شخصی قوانین تو ایک طرف پبلک لاز کے معاملہ میں بھی، تمام مسلمانوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اُمّت کے مختلف فرقوں کے علمائے کرام کے درمیان سنّت کی تعبیر میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ (جنہیں ہم چند صفحات بعد کے مضمون "کتاب و سنّت کی صحیح پوزیشن" میں پیش کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ علمائے کرام جتنی آسانی سے قرآن و سنّت کی اصطلاح پر متفق ہو گئے ہیں (اور قرار دادِ مقاصد سے لے کر آج تک اس پر متفق چلے آ رہے ہیں)۔ اس کے تحت قوانین کی تدوین کے وقت اس پر عمل اتنا ہی دشوار ہو گا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم نے تو اس کا برملا اعتراف کر لیا تھا کہ:

"کتاب و سنّت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔" (ایشیا ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت تو یہ ہے تو

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ..... (۶/۵۰ ؛ ۴۶/۹)

جو کچھ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے۔ میں اسی کا اتباع کرتا ہوں،

اور اللہ تعالیٰ کی شہادت کے ساتھ یہ فرما دیا کہ:۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ۫ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ..... (۶/۱۹)

"ان سے پوچھو کہ کس کی شہادت سب سے بڑی ہو سکتی ہے؟ میرے اور تمہارے درمیان خود اللہ کی شہادت موجود ہے کہ مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ تمہیں اور انہیں بھی، جن تک یہ بعد میں پہنچے، غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دوں۔

حضورؐ کی پیش کردہ اس شہادت کے بعد، آیئے اللہ جل شانہ، سے بھی پوچھ لیں کہ اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کس چیز کی تعلیم دی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:۔

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ ۵۵/۱-۲

الرحمٰن نے القرآن کی تعلیم دی۔

اب اگلی بات کی طرف آیئے:۔

اللہ نے کہا کہ (الدّین میں) تفرقہ نہ کرو (یعنی فرقے اور پارٹیاں نہ بناؤ) اور شریعت آرڈی ننس نے اللہ کے ارشادات کے خلاف، فرقوں کو مستقل سندِ جواز دے دی ہے۔ الدّین میں فرقے بنانے کو شرک کہا گیا ہے۔

.... وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ ۳۰/۳۱-۳۲

دیکھنا (ایمان لانے کے بعد) مشرک نہ بن جانا۔ (یعنی) ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور الگ الگ فرقے (پارٹیاں) بنالیں۔

ایسا کرنے والوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے۔ کہ ہر فرقہ (گروہ) اس طریقہ پر نازاں ہوتا ہے جو وہ اختیار کرتا ہے۔

..... كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ ۳۰/۳۲

شریعت آرڈی ننس نے فرقوں کے وجود کو سند قرار دیتے ہوئے، اللہ کے صریح حکم کے خلاف، اسلامی احکام کی تشریح و تعبیر کو ان فرقوں کے اپنے اپنے طریقے کے تابع کر دیا ہے۔ یا للعجب! اللہ کا ارشاد یہ کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ اور شریعت آرڈی ننس انہیں اجازت دے کہ اللہ کے قانون کی تشریح و تعبیر ان کے اپنے اپنے طریقوں کے مطابق ہو۔ یعنی قرآنِ کریم کو حیاتِ انسانیہ میں حکم (فیصلہ کرنے والا) بنانے کی بجائے، اسے مختلف فرقوں کی تشریح و تعبیر کے تابع کر دیا گیا ہے۔

۴، ۵ اور ۶ میں بتایا گیا ہے کہ وحی آجانے کے بعد فرقوں کی بنیاد باہمی ضد اور سرکشی (یعنی اپنے اپنے فرقے کے طریقے پر پابند رہنے کی شدید خواہش) ہے۔ اور جس چیز کی طرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دیتے ہیں (یعنی ایک الدّین) وہ مشرکین (دین میں مختلف فرقے بنانے والوں (۳۰/۳۱-۳۲) پر گراں گذرتی ہے اور جو لوگ اللہ کے بتائے ہوئے دین میں فرقے بنانے اور قائم رکھنے پر بضد ہیں۔ اگر اللہ نے اپنے قانون کے مطابق انہیں ڈھیل نہ دی ہوتی تو ان کا کام تمام ہو جاتا۔

اللہ کے اس انذار کے علی الرغم، فرقوں کے وجود کو تسلیم کر لینا۔ اور انہیں اس بات کی اجازت دینا

کہ سب اپنے اپنے طریقے پر قائم رہتے ہوئے قرآن و سنت کو ان طریقوں کے تابع رکھیں۔ اگر اللہ کے غضب کو دعوت دینا نہیں تو اور کیا ہے؟

۷، ۸، ۹، اور ۱۰ میں کہا گیا ہے کہ وحیٔ خداوندی کے بعد، قرونِ اولیٰ میں دین کے قیام کے بعد جو لوگ وارثِ کتاب ٹھہرے، انہوں نے دین کے بارے میں شکوک و شبہات کو اپنے دلوں میں جگہ دی جس سے ان کے سینے وقفِ اضطراب رہتے ہیں اور آپؐ سے کہا گیا کہ آپ استقامت سے یہی دعوت عام کرتے رہیں کہ دین صرف وحیٔ خداوندی پر مبنی ہوتا ہے (حضورؐ کے بعد یہ فریضہ اُمتِ مسلمہ کا ہے) اور آپؐ اللہ کی وحی کے خلاف لوگوں کی مفاد پرستانہ خواہشات کی پیروی نہ کریں اور یہ کہیں کہ میں تو اس پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور جو اس کتاب (قرآن کریم) میں ہے۔ اور مجھے اسی کے مطابق عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہیں۔ اللہ وہ ہے جو سب کا نشوونما دینے والا ہے۔

شریعت آرڈیننس نافذ کرتے وقت، ایسا لگتا ہے کہ صدرِ مملکت اور واضعینِ شریعت آرڈیننس کے ذہنوں میں یہ ابہام جاگزین ہو چکا ہے کہ شاید خالصتاً قرآنِ کریم پر مبنی نظام (الدین) انسانی زندگی کے مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا۔ اسی لئے ان سب کو قرآنِ کریم کے ساتھ، کچھ اور بھی شامل کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ جبکہ ذاتِ باری تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لسانِ مبارک سے کہلوایا کہ:

(i) أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۲۹/۵۱

کیا ان لوگوں کو یہ بات کافی نہیں ہوئی کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی جو ان کو سنائی جاتی رہی ہے .....

(ii) أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۶/۱۱۴

تو کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک کتاب کامل تمہارے پاس بھیج دی ہے۔ اس کی حالت یہ ہے کہ اس کے مضامین خوب صاف صاف بیان کئے گئے ہیں۔

(iii) وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ ۱۰/۳۷

اور احکام الٰہیہ (ضروریہ) کی تفصیل بیان کرنے والا ہے (اور) اس میں کوئی بات شک (شبہ) کی نہیں (اور وہ) ربّ العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

(۶) ... وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ٥ (۱۶/۸۹)

..... اور ہم نے آپ پر قرآن اُتارا ہے کہ تمام (دین کی) باتوں کا بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور خوشخبری سنانے والا ہے۔

(۷) .... وَمَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ٥ (۶/۳۸)

اور ہم نے اس کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)

اِن معروضات کے بعد ہم محترم صدرِ مملکت سے بصد احترام یہ سوال پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا کسی مملکت کے لئے کوئی ایسا آئین بنایا جا سکتا ہے جو اس مملکت کے مختلف افراد کے لئے مختلف ہو اور اسے بطور ضابطۂ مملکت نافذ کیا جا سکے؟ کیا ایسا آئین بنانے سے کوئی مملکت چار دن بھی چل سکتی ہے؟ کیا ہمارے صدرِ اوّل میں (کہ جس دور کا نقشہ ہمارے لئے نشاناتِ راہ متعین کرتا ہے۔ کوئی ایسی مثال ملتی ہے؟ حضور نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے وقت میں تو اسلامی مملکت کا ایک ہی ضابطۂ قانون تھا جو تمام افرادِ مملکت پر یکساں نافذ ہوتا تھا اور جس کا سرچشمہ صرف اور صرف قرآنِ کریم تھا اور یہی سنّتِ رسولؐ اللہ ہے۔

ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ۔

جب ہر کسی نے اپنی طبع اور اپنی مرضی کے مطابق چلنا ہے تو اجتماعی ضابطہ جسے مملکت کا آئین کہا جا سکے، کیسے اور کیونکر مرتب ہو سکے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے شریعت آرڈی ننس کا نفاذ دین کے بنیادی تصور سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اگر دین کے بنیادی تصور کو سمجھ لیا جائے اور صدرِ اوّل کے طریقِ کار کو رہنمائی کے لئے سامنے رکھا جائے تو اسلامی نظام اس طرح نافذ ہو سکتا ہے کہ:-

(۱) اس امر کا اعلان کیا جائے کہ مملکتِ پاکستان کا تمام کاروبار قرآنِ کریم کے مطابق ہوگا۔

(۲) قرآنِ کریم میں کچھ احکام و قوانین، متعیّن شکل میں دیئے گئے ہیں اور بعض اقدار، اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کے احکام و قوانین ہوں یا اصول و اقدار سب غیر متبدل ہیں اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے دی گئی ہیں۔

(۳) جن اقدار کے صرف اصول دیئے گئے ہیں، مملکت کے اربابِ فکر و نظر ــــ نمائندگانِ ملت (اُمت کی منتخب مقننہ) ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق،

ان کے جزئی قوانین مرتب کریں۔ ایسا کرنے میں وہ احادیث، تاریخ، فقہ کو اپنے سامنے رکھیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق قوانین مرتب کریں۔ جو کچھ پیچھے سے چلا آرہا ہے، اس میں جو قوانین ایسے ہوں جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں۔ اور جو ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں انہیں ویسے ہی رہنے دیا جائے۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہو، ان میں تبدیلی کر لی جائے۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو، نیا قانون بنا لیا جائے۔ اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے۔ یوں مستقل اور قابلِ تغیر و تبدل عناصر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ ملت آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

(۴) دین کا مقصد، انسان کے، اس دنیا کے معاملات کو اس طرح حل کرنا ہے کہ اس سے وہ فساد (نا ہمواری) ختم ہو جائے جس کی وجہ سے افراد اور اقوام اس بُری طرح جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں اور اس کے ساتھ ہی افراد کی ذات کی نشوونما اس طرح ہوتی جائے کہ وہ موت کے بعد بھی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ **اگر ہمارا نظام اس قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے تو وہ صحیح اسلامی ہے۔** اگر اس سے یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں کہیں خرابی ہے۔ اس خرابی (یا خرابیوں) کا سراغ ہمیں قرآن کریم کی روشنی میں مل سکتا ہے ہماری کوششوں سے مقصود ہونا چاہیئے کہ ہم ان خرابیوں کا ازالہ کر کے، دین کے نظام کو انہی خطوط پر متشکل کر سکیں جن پر یہ حضور رسالتمآبؐ کے عہد مبارک میں استوار ہوا تھا۔

اگر یہ نہیں کیا جائے گا تو اسلامی مملکت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اور ہم اسی طرح بھٹکتے پھریں گے جس طرح گذشتہ چالیس سال سے پھر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں، قرآن کریم کو اپنا رہنما بنا کر اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق دے تاکہ ہم اپنی صحرا نوردیوں اور دشت پیمائیوں کے گرداب سے نکل سکیں اور ہماری اس دنیا کی زندگی بھی سنور جائے اور ہم اگلی زندگی (حیات بعد الممات) کی ارتقائی منزلیں طے کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مزید برآں ہمارا شمار ان لوگوں میں سے نہ ہو جن کے متعلق حضور نبی اکرمؐ قرآن کے الفاظ میں داورِ محشر کے حضور یہ فریاد کریں گے کہ:-

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ ۳۰/۲۵

اور رسول کہے گا کہ اے میرے ربّ! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو اپنے خود ساختہ معتقدات کی رسّوں سے اسطرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپکو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا۔ (مفہوم القرآن)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مَهْجُوْرٌ

قرآنِ کریم میں ہے وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا (سورۃ الفرقان آیہ ۳۰) اور رسول، خدا کے حضور میں کہے گا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! میری قوم نے اس قرآن کو مَھْجُوْر بنا دیا تھا۔ اس کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآنِ کریم کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن مَھْجُوْرٌ کے معنی اس سے کہیں گہرے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو گائے یا بھینس دوڑ جاتی ہو، اس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسی باندھ دیتے ہیں اور رسی کا دوسرا سرا اس کے سینگ کے ساتھ (یا گلے میں) باندھ دیتے ہیں۔ لیکن رسی اتنی چھوٹی رکھتے ہیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رہتا ہے۔ وہ اس طرح یوں جکڑا جاتا ہے کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ عرب گھوڑوں اور اونٹوں کو اسطرح جکڑ کر باندھ دیتے تھے۔ اس طرح بندھے ہوئے جانور کو مَھْجُوْر کہا جاتا تھا۔ اَلْھِجَارُ اس رسّی کو کہتے تھے جس سے انہیں اس طرح جکڑا جاتا تھا۔ (تاج العروس)۔ رسول اللہ خدا سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآنِ کریم کو اپنے خود ساختہ اعتقادات، خیالات، رسومات، روایات قوانین، تفاسیر وغیرہ کی رسیوں سے جکڑ کر مَھْجُوْرًا بنا رکھا تھا جس سے وہ ایک قدم بھی آزادی سے نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ انہوں نے قرآنِ کریم کو چھوڑا نہیں تھا، سینوں سے لگا رکھا تھا۔ لیکن اس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی تھیں اور اسے اتنا ہی چلنے کی اجازت دے دی جاتی تھی جتنی انکے خود ساختہ "مذہب و شریعت" کی رسّی مناسب سمجھتی تھی۔ یعنی یہ قرآن کے تابع نہیں تھے، قرآنِ کریم ان کے تابع تھا۔ یہ ہے مطلب قرآنِ کریم کو مَھْجُوْرًا بنا دینے کا۔

(لغات القرآن۔ جلد چہارم صـ۱۷۵۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہ سلسلۂ آئین سازی

کتاب و سُنّت

کی صحیح پوزیشن

اور علمائے کرام کے باہمی اختلاف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محررہ جولائی ۱۹۶۲ء

کتاب و سنّت

آئین کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات طلوعِ اسلام کی طرف سے مرتّب اور شائع کئے گئے ہیں، ان میں بنیادی طور پر یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ مجوزہ آئینِ پاکستان کی پہلی، اساسی اور اصولی شق یہ ہونی چاہیئے کہ

"مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کے غیر متبدّل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا اور مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو۔"

طلوعِ اسلام کا مطالبہ

طلوعِ اسلام کا یہ مطالبہ نیا نہیں۔ اس نے تحریکِ پاکستان کی تائید اسی وجہ سے کی تھی کہ اس کے نزدیک مملکتِ پاکستان کی عمارت قرآنِ کریم کی غیر متبدّل بنیادوں پر استوار ہونی تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، طلوعِ اسلام آئین سازی کے سلسلہ میں، اپنے اس مطالبہ کو مسلسل اور متواتر دہراتا رہا۔ اب جبکہ آئین سازی کا مسئلہ دوبارہ زیرِ غور ہے اس نے اس مطالبہ کو پھر پیش کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس مطالبہ کے حق میں فضا اس قدر سازگار ہو گئی ہے کہ اس سے پہلے، مغرب کی مادہ پرستی سے متاثر اور روس کی کمیونزم کے دلدادہ گروہوں کی طرف سے اس کی جو مخالفت ہوا کرتی تھی۔ اب اس کی آواز کہیں سے سنائی نہیں دی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

قرآن کی مخالفت

لیکن ایک گروہ ایسا ہے کہ اس مطالبہ کی مخالفت میں اب بھی ویسا ہی سرگرم ہے جیسا پہلے تھا یہ گروہ ہمارے علمائے کرام کا ہے۔ انہوں نے سابقہ آئین سازی کے زمانے میں اس مطالبہ کی مخالفت کی تھی اور اب پھر اس کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ چنانچہ اگلے دنوں لاہور میں مختلف فرقوں کے اُنیس نمائندگان کا اجتماع ہوا جس میں آئین کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات متفق طور پر مرتّب کئے گئے۔ ان جوابات میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۵۶ء کے (منسوخ شدہ) دستور کو بحال کیا جائے کیونکہ وہ صحیح اسلامی دستور تھا۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ اُس دستور میں یہ دفعات رکھی گئی تھیں کہ:

(۱) مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو کتاب و سنّت کے خلاف ہو۔ اور

(۲) جہاں تک شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) کا تعلق ہے "کتاب و سنّت" کی تعبیر

مسلمانوں کے مسلّم فرقوں کے عقائد کے مطابق کی جائے گی۔

بالفاظ دیگر، ان علمائے کرام کی طرف سے جس مطالبہ کا اعادہ کیا گیا ہے اور جس کی بنا پر یہ حضرات خیال کرتے ہیں کہ آئین صحیح اسلامی کہلا سکتا ہے، یہ ہے کہ

(۱) مملکت میں کتاب کے ساتھ سنّت کو بھی برابر کی حیثیت دی جائے اور کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے جو سنّت کے خلاف ہو۔

(ہم نے "برابر کی حیثیت" اس لئے لکھ دیا ہے کہ ان حضرات نے "کتاب و سنّت" کا ذکر کرتے وقت بظاہر ان میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ورنہ جیسا کہ آگے چل سامنے آئے گا۔ ان کے مطالبہ کی رُو سے کتاب اللہ کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ سنّت قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔)

(۲) مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو آئینی سند عطا ہو جائے۔ اور

(۳) قانون کے دو حصّے کئے جائیں شخصی اور ملکی۔

کتاب و سنّت

طلوعِ اسلام میں ان مسائل کے متعلق اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن چونکہ انہیں (اور بالخصوص "مقامِ سنّت" کے سوال کو) آئین کے سلسلہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مقام پر ایک بار پھر تفصیل سے بات کی جائے کہ کتاب کے ساتھ سنّت کے اضافہ کا عملی نتیجہ کیا ہے اور ہم نے اسے کیوں حذف کیا ہے۔

سنّت سے مفہوم سنّتِ رسول اللہ (صلعم) ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ موضوع کس قدر نازک ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کی نسبت حضورؐ اقدس و اعظم کی ذاتِ گرامی کی طرف ہو جائے اس کا تعلّق ہمارے گہرے جذبات سے ہو جاتا ہے اور جن امور کا تعلق جذبات سے ہو ان کے متعلق گفتگو بڑی نزاکت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ موضوع تو پھر بھی رسول اکرمؐ کی سنّت سے متعلّق ہے۔ اس باب میں ہمارے جذبات کی نزاکت

موضوع کی نزاکت

کا تو یہ عالم ہے کہ اگر کسی پتھر کے ٹکڑے کے متعلق مشہور ہو جائے کہ اس پر حضورؐ کا نقشِ پا مرتسم ہے تو اس نسبت سے اس پتھر کی عظمت و احترام کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ کوئی شخص اس کے خلاف ایک لفظ تک سننا گوارہ نہیں کرتا۔ ان حالات کے ماتحت ذرا سوچئے کہ اگر کسی کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ وہ آئینِ پاکستان میں سنّت رسول اللہ کو شامل نہیں ہونے دینا چاہتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہمیں افسوس (اور انتہائی صدمہ) ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے، علم و حقائق کی روشنی میں غور کرنے کے بجائے، ہمیشہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا مسلک اختیار کیا ہے۔ اور کبھی اتنا سمجھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی کہ طلوعِ اسلام اس

باب میں کیا کہتا ہے؟ ہم ان حضرات کی خدمت میں بالعموم اور ملک کے دوسرے باہوش طبقہ سے بالخصوص عرض کریں گے کہ جو کچھ آئندہ سطور میں پیش کیا جاتا ہے خدا کے لئے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ اس سوال کا آئینِ پاکستان سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔ یہ سوال کس قدر عمیق فکر و تدبر کا محتاج ہے اور اگر اس کے متعلق ٹھنڈے دل سے نہ سوچا گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں ایک گروہ کی طرف سے ہمیشہ یہ سوال سامنے لایا جاتا رہا ہے کہ جس ملک میں اس قدر مذہبی فرقے موجود ہوں اور ان فرقوں میں اس قدر باہمی اختلاف ہو، وہاں ایک متفق علیہ اسلامی آئین کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے؟ ہمارے علمائے کرام کی طرف سے اس اعتراض کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ کراچی میں مختلف فرقوں کے اکتیس علماء نے متفقہ طور پر آئین کا مسودہ پیش کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اتفاق اور اتحاد کا ثبوت اور کیا دیا جا سکتا ہے؟ اسی اتفاق و اتحاد کا مظاہرہ اب لاہور

علماء کا متفقہ مطالبہ

کے انہیں علماء کی طرف سے کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے کہ جب مختلف فرقوں کے نمائندے متفقہ طور پر ایک مطالبہ پیش کرتے ہیں تو پھر ان کے باہمی اختلاف کا سوال کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟ لیکن ذرا دیکھئے کہ وہ متفقہ مطالبہ کیا ہے؟ وہ مطالبہ یہ ہے کہ آئینِ پاکستان کی بنیاد "کتاب و سنت" پر رکھ دی جائے۔ اور ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہ ہو جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ اس متفق علیہ مطالبہ کی حقیقت کیا ہے؟

جب ہم "قرآن" کا لفظ زبان پر لاتے ہیں تو ہر مسلمان فوراً سمجھ لیتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس سے مراد ایک کتاب ہے جس میں الحمد سے والناس تک جو کچھ لکھا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے

قرآن کریم

حضور نبی اکرمؐ کی طرف وحی کے ذریعے نازل کیا تھا اور وہ لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً ہم تک محفوظ شکل میں پہنچا ہے۔ اس کے زیر زبر تک میں کسی کو اختلاف نہیں[1]۔ لہٰذا جب ہم کہیں کہ پاکستان میں کوئی بات قرآن کے خلاف نہیں ہوگی تو اس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ قرآن سے مفہوم کیا ہے۔ نہ ہی اس باب میں کبھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ فلاں آیت جسے آیتِ قرآنی کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے، قرآن کی آیت ہے یا نہیں۔ آیت تو ایک طرف، اگر کوئی شخص اس میں ایک لفظ کا ردوبدل کرے تو سینکڑوں آوازیں بیک وقت پکار اٹھیں گی کہ وہ قرآن کا لفظ نہیں ہے۔

---

[1] یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنی آیات کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ اس کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ سر دست بحث قرآن کریم کے متن تک محدود ہے۔

سنّت کسے کہتے ہیں؟

سوال یہ ہے کہ کیا "سنّت" کی بھی یہی کیفیت ہے؟ جب ہم "سنّت" کا لفظ بولتے ہیں تو کیا اس سے ہر مسلمان کا ذہن کسی خاص کتاب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے متعلق اس کا ایمان ہے کہ اسکا ایک ایک لفظ "سنّت" ہے؟ اور کیا اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک قرآن کے متن کی طرح متّفق علیہ اور تنقید کی حد سے بلند ہے؟ اس سوال کا جواب پہلے آپ خود اپنے دل سے مانگئے اور دیکھئے کہ کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسی کتاب آتی ہے جسے آپ سنتِ رسول اللہ کا اسی طرح مستند مجموعہ سمجھتے ہوں جس طرح قرآن کریم کو وحیٔ خداوندی کا مجموعہ سمجھتے ہیں؛ اس کے بعد آپ ان اُنیس علماء کرام سے دریافت کیجئے کہ کیا وہ کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر سکتے ہیں جو تمام علماءِ اُمّت کے نزدیک تو ایک طرف، ان اُنیس علماء کے نزدیک قرآن کریم کی طرح متّفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو؟ آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ یہ حضرات اس بات پر بھی آپس میں متفق نہیں کہ سنّت کسے کہتے ہیں؛ آپ کو یہ دعوے کچھ تعجب انگیز سا دکھائی دے گا لیکن یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ آپ خود اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیجئے آپ خط لکھ کر ان سے دریافت کریں اور پھر دیکھیں کہ ان کی طرف سے اس استفسار کا جواب کیا موصول ہوتا ہے؟

اس اجتماع میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے نمائندے شامل تھے۔ ہم چاہتے تو شرح وبسط سے بتا سکتے تھے کہ سنّت کے مسئلہ میں ان فرقوں کے بانیوں کے، یا ان کے دیگر ائمہ سلف کے باہمی اختلافات کس قدر شدید تھے۔ لیکن یہ انداز اختیار کرنے کے بجائے ہم نے اسے زیادہ مناسب سمجھا ہے کہ بتایا جائے جو حضرات اس اجتماع میں شریک تھے اور جن کی طرف سے یہ متّفقہ مطالبہ پیش کیا گیا ہے، سنّت کے بارے میں خود ان میں کس قدر سخت اختلافات ہیں۔ ان میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب تھے جو جامعہ اہلِ حدیث گوجرانوالہ کے خطیب ہیں (ان کے ساتھ مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسحٰق صاحب، مدیر الاعتصام تھے جو اسی مکتبِ فکر سے متعلق ہیں)، دوسری طرف مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا ابوالحسنات قادری صاحب، امیر حزب الاحناف پاکستان (اور ان کے دیگر ہم خیال حضرات) حنفی مکتب فکر کے نمائندہ تھے (اگرچہ ان میں بھی دیوبندی اور بریلوی حضرات کے باہمی اختلافات ہیں)۔ ندوہ کے نمائندہ مولانا محمد حنیف صاحب تھے۔ (سابق) جماعت اسلامی کے امیر، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تھے دیکھنا یہ ہے کہ سنّت کے متعلق ان حضرات کے باہمی اختلافات کس قدر ہیں۔ واضح رہے کہ ان کے یہ اختلافات سنّت کی تعبیر کے اختلافات نہیں۔ اختلافات اس امر میں ہے کہ (۱) سنّت کسے کہتے ہیں اور (۲) فلاں حدیث جو پیش کی جا رہی ہے وہ رسول اللہ کی حدیث ہے بھی یا نہیں۔

باہمی اختلاف

چندہی سال ادھر کا ذکر ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث"۔ اس میں انہوں نے مودودی صاحب (اور ان کے ہمنواؤں) کے مسلکِ حدیث پر سخت تنقید کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ حضرات "سُنّت" سے جو مفہوم لیتے ہیں اس سے ان کے مسلک کے ڈانڈے منکرینِ حدیث سے جا ملتے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے رسالہ میں منکرینِ حدیث کی جو فہرست شائع کی تھی اس میں سرسیدؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ کے ساتھ مودودی صاحب، امین احسن اصلاحی صاحب اور عام فرزندانِ ندوہ کو بھی شامل کیا تھا۔ اگرچہ ان کے متعلق لکھا تھا کہ

"یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے اندازِ فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے۔ اور طریقِ گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔" (ص ۴۷)

مولانا اسمٰعیل صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ سنّت اور حدیث مرادف الفاظ ہیں۔ یعنی حدیث ہی کو سُنّت کہا جاتا ہے۔ ان کی اس تعریف کی رُو سے "کتاب و سُنّت" کے معنی ہوں گے "قرآن و حدیث"۔ لیکن

مودودی صاحب کے نزدیک

سنّت کا مفہوم اس سے الگ ہے۔ وہ اپنی کتاب "رسائل و مسائل" میں لکھتے ہیں۔

"سنّت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے[1]۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ

---

[1] ممکن ہے اس مقام پر مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، مودودی صاحب سے یہ پوچھیں کہ اس سے پہلے آپ یہ لکھ چکے ہیں کہ

"جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منصبِ رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپؐ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسولؐ تھے۔ آپؐ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپؐ مبلّغ اور معلّم بھی تھے۔ مربّی اور مزکّی بھی تھے۔ قاضی اور حاکم بھی تھے۔ امام اور امیر بھی تھے۔ حتّٰی کہ آپؐ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے حالات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے۔" (تفہیمات حصہ اوّل۔ ص ۲۴۱)

اور اب آپ حضورؐ کی شخصی زندگی اور رسالت کی زندگی کو الگ الگ قرار دے رہے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ کیا ہے؟ مودودی صاحب کے ہاں اس قسم کے تضادات عام ملیں گے۔

فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جز سنّت ہے اور کونسا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو..... تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلعم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپؐ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنّت بنا دینا مقصود نہ تھا" (ص ۳۱۱ ز ص ۳۱۷)

اسی کتاب میں وہ ص ۳۱۴ پر لکھتے ہیں۔

"بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپؐ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنّت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبیؐ پہنتے تھے اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سنّت بنا دیں۔ سنّت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنّت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنّت قرار دے لینا منجملہ اُن بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے"۔

یعنی مولانا اسمٰعیل صاحب کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنّت رسول اللہ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنّت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنّت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ:۔

"میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنّت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے"۔ (ایضاً ص ۳۱۸)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں۔

"جو امور آپؐ نے عادۃً کیے ہیں انہیں سنّت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے"۔ (صفحہ ۳۰)

اس کا نتیجہ ان تصریحات کی روشنی میں ایک عملی شکل کو سامنے لائیے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی جاتی ہے کہ یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "کتاب و سنّت" کے خلاف ہو۔ ایک قانون ملک میں نافذ ہو جاتا ہے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب چیلنج کرتے ہیں کہ وہ "سنّت" کے خلاف ہے اس لیے وہ قانون ناجائز ہے۔ اس کی تائید میں وہ ایک حدیث پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مودودی صاحب تشریف لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ قانون سنّت کے خلاف نہیں۔ مولانا اسمٰعیل صاحب دریافت کرتے ہیں کہ انہوں نے جو حدیث پیش کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ مودودی صاحب جواب دیتے ہیں کہ وہ حدیث تو صحیح ہے لیکن رسول اللہؐ نے وہ عمل اپنی بشری حیثیت سے عادۃً فرمایا تھا رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں کیا تھا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ حضورؐ نے وہ کام عادۃً کیا تھا۔ مودودی صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے۔

"جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ رسول اللہؐ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے ..... اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے ..... اس مقام پر پہنچ کر وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس جامِ زرّیں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے۔ وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی"۔

تفہیمات، حصہ اول صفحہ ۳۰۲ تا صفحہ ۳۲۴

مولانا اسمٰعیل صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

"اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسولؐ کا مزاج شناس تصوّر کر لے، پھر اسے اختیار دیدے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول

کرے جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلا دجہ کسی موضوع یا مختلق۔ مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعوے کر دے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے۔ اور سنتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔" (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث صـ۲۳)

یعنی جس چیز کو مودودی صاحب سنتِ رسول اللہ قرار دیتے ہیں۔ اسے مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنّت کے خلاف ہوائی حملے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور سنّت کو ایسے حملوں سے محفوظ رکھنے کو اپنا فریضہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے باوجود دونوں کا دعوٰی ہے کہ ہمارا مطالبہ متفق علیہ ہے۔

اصلاحی صاحب

یہاں تک بات صرف مودودی صاحب اور مولانا اسمٰعیل صاحب کے درمیان تھی۔ اس کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تشریف لاتے ہیں ان کا ارشاد ہے کہ

"حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی صلعم کی نسبت کے ساتھ کی جائے۔ لیکن سنّت سے مراد نبی صلعم کا صرف ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپ نے بار بار عمل کیا ہو۔ جس کی آپ نے محافظت فرمائی ہو۔ جس کے حضورؐ عام طور پر پابند رہے ہوں"۔ (ایضاً صـ۲۵)

اس کے متعلق مولانا اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں۔

"مولانا (اصلاحی) نے سنّت کی تعریف کو اس قدر سکیڑ دیا ہے کہ اس کا تعلق صرف چند اعمال سے ہی ہوگا۔ جن کا ثبوت آنحضرتؐ سے علیٰ سبیل الاستمرار ہے جیسے نماز کے بعض ارکان . . . . . . ہزار دفعہ فرمایا جائے کہ "اگر کوئی شخص اس سنّت کو مآخذِ دین تسلیم نہیں کرتا تو میں اسے مسلمان تسلیم نہیں کرتا" سوال یہ ہے کہ اس سنّت کی پہنائی ہے کہاں تک۔ اس کا احاطہ چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ سے ہی ثابت کرنا ہوگا۔ پھر اس ادعا کی ضرورت ہی کیا ہے"۔ (ایضاً صـ۲۶)

یہ ہے "سنّت" کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق ان حضرات کا وہ اختلاف جس کی بنا پر مولانا اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں کہ!

"میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلکِ اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال و تجہمّ کے جراثیم مخفی ہیں"۔ (ایضاً صـ۱۱)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب و سنّت" کا متفقہ مطالبہ کرنے والوں میں اس امر پر بھی اتفاق نہیں کہ "سنّت

کہتے ہیں" جو چیز ایک کے نزدیک "سنّت" ہے وہ دوسرے کے نزدیک "بدعت اور دین میں تحریف" ہے۔

حدیث

جو کچھ اُوپر لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ صحیح احادیث کی موجودگی میں بھی یہ ممکن نہیں کہ یہ حضرات "سنّت" کا کوئی متّفق علیہ مجموعہ پیش کر سکیں۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ان حضرات کے پاس احادیث کا کوئی ایسا مجموعہ ہے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ قطعاً نہیں۔ احادیث کے بے شمار مجموعے ہیں۔ مولانا سندھی (مرحوم) کے الفاظ میں ——

"میں نے شیخ عبدالحق محدّث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستّہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں، جس طرح باقی کتب میں۔ تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہو گئی۔"

(مقام حدیث جلد اول صہ ۲۴۹)

یعنی (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تحقیق کے مطابق) احادیث کے قریب پچاس مجموعے ہیں اور سب میں غلط اور صحیح احادیث ملی جلی ہیں۔ ان میں چھ کتابوں کو "صحاح ستّہ" (یعنی صحیح کتابیں) کہا جاتا ہے۔ ان میں بھی اختلاف ہے کہ یہ چھ کون کون سی ہیں۔ لیکن ان میں سے بخاری اور مسلم کو سب سے اونچا درجہ دیا جاتا ہے۔ پھر ان دونوں میں بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔

"حدیث" کے متعلق مولانا اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں۔

قرآن اور حدیث کی ایک حیثیت ہے

"تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا..... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنّت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں۔ ان کا انکار کفر ہو گا اور ملّت سے خروج کے مرادف۔"

(ایضاً صہ ۴۸)

بخاری اور مسلم کے مجموعوں کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

"بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر اُمّت متفق ہے ..... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔"

(ایضاً صہ ۵۵)

بالفاظ دیگر مولانا اسمٰعیل صاحب کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کے انکار کا وہی اثر ہے جو قرآن عزیز

کے انکار کا ہے ان احادیث کا انکار کفر ہے۔ اور ایسا کرنے والا مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

"جبرئیل قرآن اور سنّت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنّت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔" (ایضاً صہ ۶۰)

یعنی قرآن اور حدیث دونوں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی حضورؐ کو ملے تھے اور دونوں کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں اب دیکھئے اس باب میں مودودی صاحب کیا فرماتے ہیں۔

مودودی صاحب کا مسلک

"قرآن کے کلام اور محمد صلعم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اس قدر مختلف اسٹائل کبھی نہیں ہو سکتے۔ یہ فرق صرف اسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جب کہ نبی صلعم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے تھے۔ بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔"

(ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء)

اس سے مودودی صاحب نے واضح کر دیا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا یہ ارشاد کہ احادیث بھی قرآن کی طرح منزل من اللہ وحی ہیں، صحیح نہیں۔ قرآن خدا کا کلام ہے۔ اور احادیث، نبی اکرمؐ کا اپنا ارشاد۔ اور دونوں کا فرق بالکل بدیہی اور واضح ہے۔

دوسرے مقام پر مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

"ان امور کے متعلق (یعنی دجّال کے متعلق) جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپؐ خود شک میں تھے۔ ..... یہ باتیں آپؐ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپؐ کا گمان وہ چیز نہیں جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپؐ کی نبوّت پر کوئی حرف آتا ہو یا جس پر ایمان لانے کے لیے ہم مکلّف کیے گئے تھے۔" (رسائل و مسائل صہ ۵۶، ۵۵)

اس کے بعد وہ رسائل و مسائل صہ ۶۷ پر لکھتے ہیں۔

"احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ صحت ہے نہ کہ علمِ یقینی۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا

ہرگز پسند نہیں کرسکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق واقع نہ ہوتا ہو انہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں۔"

مودودی صاحب نے یہ خیالات "ظہور مہدی" سے متعلق احادیث کے سلسلہ میں ظاہر فرمائے ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ صرف ظہور مہدی سے متعلق احادیث کو ایسا سمجھتے ہیں۔ تمام احادیث کے متعلق ان کے یہی خیالات ہیں۔ چنانچہ وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"نبی صلعم کے قول و فعل کو میں بھی قرآن کی طرح حجت مانتا ہوں اور میرے نزدیک جو عقیدہ حضورؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم آپؐ نے ارشاد فرمایا ہو وہ اسی طرح ایمان و اطاعت کا مستحق ہے جس طرح کوئی ایسا عقیدہ یا حکم جو قرآن میں آیا ہو۔ لیکن قولِ رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول و فعل کو نبی صلعم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔"

(رسائل و مسائل صہ ۲۷۰)

آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"اصل واقع یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔"

(ایضاً صہ ۲۹۰)

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک، احادیث کے پرکھنے کی کسوٹی "مزاج شناسِ رسولؐ" کی نگہ بصیرت ہے۔ جس حدیث کو وہ صحیح کہدے، وہ صحیح ہو گی۔ جسے وہ غلط قرار دیدے وہ غلط قرار پا جائے گی۔ لیکن ان کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں کہ کسی کی "نگہ بصیرت" دوسرے کے لئے سند نہیں قرار پا سکتی۔ وہ فرماتے ہیں۔

"اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔

لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی چیز شرعی ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو شرعی کہتی ہے وہ قطعاً ویقیناً غلط ہے۔"
(تفہیمات حصہ دوم۔ صا۳۳)

جو کچھ اُوپر کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک:

(i) جو عقیدہ نبی اکرمؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم حضورؐ نے دیا ہو اس پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآن میں بیان کردہ عقیدہ یا حکم پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت کرنا۔

(ii) جو کچھ نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا وہ احادیث کی کتابوں میں منقول ہے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ سب کچھ نبی اکرمؐ کا فرمودہ ہے۔ وہ صرف رسول اللہ کی طرف منسوب ہے۔

(iii) اس کا فیصلہ کرنا نہائیت ضروری ہے کہ جو کچھ رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس میں فی الواقعہ رسول اللہ کا فرمودہ کیا ہے اور وہ کون سی باتیں ہیں جنھیں حضورؐ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔

(iv) اس چیز کا فیصلہ "مزاج شناس رسول" کی نگہ بصیرت ہی کر سکتی ہے۔

(v) لیکن نگہ بصیرت ہر شخص کی الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ایک شخص فرمودۂ رسولؐ قرار دیدے، اسے دوسرا شخص بھی بالضرور فرمودۂ رسولؐ تسلیم کر لے۔

مودودی صاحب منکرِ حدیث ہیں

مودودی صاحب کے انہی خیالات کو پڑھ کر، مولانا ظفر احمد عثمانی صدر جمعیت علمائے پاکستان نے اپنے فتوے میں لکھا تھا کہ

"یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ گمراہ اور مبتدع ہے، جاہل اجہل ہے۔ پاگل ہے۔" (مقامِ حدیث صا۱۔۴۰۹)

قطع نظر اس کے کہ مودودی صاحب کے متعلق اہلحدیث اور حنفی علماء کے خیالات کیا ہیں، غور طلب بات یہ ہے کہ حدیث کے متعلق جو نظریہ انہوں نے بیان فرمایا ہے اس کا عملی نتیجہ کیا ہو گا۔ اگر دین انفرادی چیز ہو تو ہو سکتا ہے کہ جس بات کو زید اپنی نگہ بصیرت کے مطابق فرمودۂ رسولؐ سمجھے وہ اس پر عمل کرے اور جسے بکر، اپنی بصیرت کے مطابق فرمودۂ رسول سمجھے وہ اس پر عمل پیرا ہو جائے۔ دونوں کو ان کی "حسنِ نیت" کا ثواب مل جائے گا۔

عملی نتیجہ

لیکن جب آپ "فرمودۂ رسولؐ" کو مملکت کے آئین اور حکومت کے قوانین کی غیر متبدّل اور ابدی بنیاد قرار دیدیں اور اس امر کا فیصلہ کر دیں کہ مملکت میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو گا جو "فرمودۂ رسول" کے خلاف ہو اور کسی بات کے "فرمودۂ رسول" ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ افراد کے ذوق

اور بصیرت کے مطابق ہو تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا اس وقت پاکستان میں کوئی قانون بھی بن سکے گا؟

مولانا اسمٰعیل صاحب نے فرمایا تھا کہ صحیحین۔ یعنی بخاری اور مسلم کی سب احادیث صحیح ہیں اور ان میں سے کسی کا انکار کفر ہے۔ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں کہ۔

بخاری کی احادیث

"یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔" (ترجمان القرآن۔ اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء)

یہ خیال تنہا مودودی صاحب ہی کا نہیں۔ پاکستان میں اکثریت حنفی مسلمانوں کی ہے۔ اسی مکتبِ فکر کے ایک جیّد عالم مولانا ظفر احمد خاں عثمانی، صدر مدرس جامعہ اشرفیہ ٹنڈوالہ یار (جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں فرماتے ہیں۔

حنفیہ کے نزدیک بھی کتاب البخاری ومسلم اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہیں۔ اور مسلم پر بخاری کو ترجیح ہے مگر اس سے وہ مواضع مستثنیٰ ہیں جن پر دارقطنی وغیرہ محدثین نے تنقید کی ہے کہ ان کی صحت پر اتفاق نہیں بلکہ محلِ اختلاف ہیں۔ دارقطنی وغیرہ نے تقریباً دو سو احادیث پر تنقید کی ہے جو بخاری ومسلم میں موجود ہیں۔ ان مواضع کے سوا بقیہ کی صحت پر اتفاق ہے۔"

(طلوعِ اسلام اگست ۵۹ء۔ ص ۶۷)

بخاری ومسلم کی احادیث کے متعلق یہ عقیدہ حنفی علماء کا ہے۔ بخاری کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے جماعت اہلِ حدیث کے سرخیل۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) ترجمان القرآن۔ جلد دوم (ص ۵۰۰-۴۹۹) میں لکھتے ہیں کہ

"روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو۔ بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کیلئے یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں مان لینا پڑیگا کہ یہ بخاری کی روایت در بارہ کذب حضرت ابراہیمؑ) اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔"

یعنی مولانا آزاد (مرحوم) کے نزدیک بخاری اور مسلم میں بھی ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں قولِ رسولؐ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس مقام پر مختصر طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ

احادیث مرتب کیسے ہوئی تھیں؟

احادیث کے یہ مجموعے (مثلاً بخاری وغیرہ) مرتب کس طرح ہوئے تھے؟ یہ واقعہ ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ

(۱) نبی اکرمؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کرا کر اُمت کو نہیں دیا۔

۲۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اس قسم کا کوئی مجموعہ مرتب کیا (انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)

۳۔ رسول اللہ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد امام محمد بن اسمٰعیل نے (جو بخارا کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی) اپنے طور پر احادیث کو جمع کرنا شروع کیا۔ ان کے سامنے کوئی تحریری ریکارڈ نہیں تھا۔ انہوں نے ان روایات کو جمع کیا جو زبان زدِ خلائق تھیں اور جنہیں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ مثلاً اس کا طریق یہ تھا کہ جس شخص نے امام بخاریؒ سے کوئی روایت بیان کی اس نے کہا کہ میں نے یہ بات فلاں صاحب سے سنی تھی۔ انہوں نے فلاں سے سنی۔ انہوں نے فلاں سے۔ انہوں نے فلاں صحابیؓ سے جنہوں نے کہا کہ رسول اللہ نے یوں ارشاد فرمایا تھا۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ اس طرح انہوں نے قریب چھ لاکھ احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انہوں نے ۷۲۷۵ احادیث کو اپنی شروط کے مطابق پایا۔ باقی کو مسترد کر دیا۔ ان میں سے اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو باقی روایات کی تعداد ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔ انہیں امام بخاریؒ کی احادیث کہا جاتا ہے۔

اس طریق سے جمع کردہ روایات میں غلطیاں کس انداز سے ہوتی ہیں۔ ان کے متعلق مودودی صاحب نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ روایت میں سب سے پہلے بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ فلاں صحابیؓ نے کہا کہ رسول اللہ نے یوں ارشاد فرمایا تھا اس ضمن میں مودودی صاحب (بخاری کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے) لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب کی تنقید

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبیؐ کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہوں گے ..... اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں سے بعض کو بعض روایات نے صاف کر دیا ہے اور بعض صاف ہونے سے رہ گئیں۔ زبانی روایات میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔"

(تسنیم۔ احادیث نمبر۔ مورخہ ۱۰/۵۹ ص ۱۴)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک سلسلۂ روایات کی پہلی کڑی میں ہی غلط فہمیوں کی گنجائش تھی۔ اب رہیں بعد کی کڑیاں۔ سو اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا

چاہیے لیکن ہر شخص بادنیٰ تامّل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو۔ اس کی نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس پر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سرمو فرق نہ پایا جائے۔ اُس واقعہ یا اُس تقریر کے اہم اجزا میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کریگا۔ کوئی اس مفہوم کو جو اسکی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دیگا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اسکا صحیح ملخّص بیان کریگا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح نہ ادا کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصّے لفظ بلفظ نقل کر دیگا کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی وہ نقل در روایت میں غلطیاں کریگا۔"

(تفہیمات۔ حصّہ اوّل۔ ص ۳۰-۳۲۹)

یہ تھا وہ طریق جس کے مطابق احادیث کے مجموعے مرتّب ہوئے۔ آپ خیال فرمائیے کہ اس انداز سے مرتّب شدہ احادیث میں سے کسی حدیث کے متعلّق بھی حتمی اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مِن وعَن رسول اللہ کا قول ہے؟ یہ بھی واضح رہے کہ احادیث کے متعلّق یہ کسی کا بھی عقیدہ نہیں کہ وہ رسول اللہ کے الفاظ ہیں جو راویوں نے آگے منتقل کئے ہیں ان کے متعلّق عقیدہ یہ ہے کہ وہ، رسول اللہ کے الفاظ کا مفہوم ہیں۔ یعنی رسول اللہ نے کچھ فرمایا سننے والے صحابیؓ نے حضورؐ کے الفاظ کا جو مفہوم سمجھا اسے اپنے الفاظ میں آگے بیان کیا۔ اس نے اس صحابیؓ کے الفاظ سے جو مطلب سمجھا اسے اپنے الفاظ میں آگے روایت کیا۔ اس طرح یہ مفہوم، مختلف راویوں کے الفاظ میں آگے منتقل ہوتا چلا گیا تا آنکہ آخری راوی کا بیان حدیث کے مجموعہ میں شامل کر لیا گیا۔

فرض کر لیجئے کہ ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد، کسی حدیث کے متعلّق اس پر اتّفاق ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے بعد وہ حدیث سب کے نزدیک واجب العمل ہو جائے گی؟ آپ کہیں گے کہ اسمیں اب کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ اسے واجب العمل ہو جانا چاہیئے لیکن نہیں۔ اسکے بعد ابھی ایک اور مرحلہ باقی ہے

ہر صحیح حدیث بھی واجب العمل نہیں

جماعت اسلامی سے جو حضرات الگ ہوئے تھے ۔ انہوں نے مودودی صاحب کے خلاف ایک الزام یہ بھی عاید کیا تھا کہ وہ جب تک نظری سیاست کی منزل میں رہے، دین کے مطابق اصولوں کی تبلیغ کرتے رہے۔ لیکن جب عمل سیاست کا وقت آیا تو کچھ اور ہی روش اختیار کر لی۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے لکھا کہ یہ بات کچھ میں نے انوکھی نہیں کی۔ (معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ نے یہی کیا تھا۔ حضورؐ ساری عمر اخوت و مساوات کے اصولوں کی تبلیغ فرماتے رہے لیکن جب عملاً تشکیلِ حکومت کا وقت آیا تو آپؐ نے فرمایا "الائمۃ من قریش" خلافت قریش میں رہے گی۔ مودودی صاحب کے فریق مقابل (مولانا امین احسن صاحب اصلاحی) "الائمۃ من قریش" والی حدیث کو صحیح مانتے ہیں۔ لیکن انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ کا یہ حکم مستقل نہیں تھا۔ آپؐ نے ایک قضیہ کا وقتی فیصلہ دیا تھا۔ اور

ایک مستقل حکم دینے اور کسی قضیہ کا وقتی فیصلہ کرنے میں (بڑا باریک) فرق ہوتا ہے۔ (میثاق ۔ دسمبر ۱۹۵۹)

اس اصول کو خود مودودی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان سے جب (ضبطِ ولادت کے سلسلہ میں) عزل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ

"عزل کے متعلق جو کچھ آنحضورؐ سے پوچھا گیا اور اس کے جواب میں جو کچھ حضورؐ نے بیان فرمایا اس کا تعلق صرف انفرادی ضروریات اور استثنائی حالات سے تھا ..... عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوری بیان کی اور آنحضورؐ نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔"

(ترجمان القرآن بابت اپریل ۱۹۶۰ء)

لہٰذا جس حدیث کو فریقین صحیح تسلیم کر لیں اس کے متعلق بھی یہ سوال پیدا ہو گا کہ حضورؐ کا وہ حکم مستقل تھا یا آپؐ نے ہنگامی استثنائی یا انفرادی قضیہ کا فیصلہ کرنے کے لیے ایسا ارشاد فرمایا تھا۔ آخر الذکر کی صورت میں اس حکم کی اطاعت لازم نہیں آئے گی۔ اب سوچئے کہ اس کا فیصلہ کس طرح سے ہو گا کہ حضورؐ کا فلاں حکم مستقل نوعیت کا تھا یا ہنگامی اور انفرادی حیثیت رکھتا تھا؟ چنانچہ، اصلاحی صاحب "الائمۃ من قریش" کے حکم کو ہنگامی قرار دے دیتے ہیں۔ اور مودودی صاحب عزل کی اجازت کو انفرادی قرار دیتے ہیں اور ان کے فریق مقابل اسے عام اجازت تصور کرتے ہیں۔

حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے

آپ کہہ دیں گے کہ حدیث کو پرکھنے کا سیدھا اور صاف طریقہ یہ ہے کہ جو حدیث، قرآن کریم کے خلاف جائے۔ اُسے

غلط قرار دے دیا جائے۔ یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے لیکن ہمارے علمائے کرام کا عقیدہ اس باب میں کچھ اور ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حدیث، قرآن کریم کے خلاف بھی ہو سکتی ہے اور جب قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو تو حدیث قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے۔ چنانچہ علامہ مولوی حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی۔ اپنے کتابچہ، فتنۂ انکار حدیث، میں لکھتے ہیں۔

"نبیؐ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب تو حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے ..... جس طرح قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو۔ تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت ہو اسی طرح نبیؐ کے قول کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو"۔ (صـ۸۲)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

"رہی یہ بات کہ قولِ رسولؐ قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَنِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (۲/۱۸۰) "تمہارے اُوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے"۔ رسول اللہؐ نے فرمایا لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ اور قولِ رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔" (صـ۸۵)

اس کے بعد وہ اس کی علت سمجھاتے ہیں۔

"اب اگر یہ کہا جائے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسولؐ کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسولؐ کا قول قرآن کو نسخ کر دے۔ تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رسول کا قول اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسولؐ کا قول بھی خدا کا قول ہے۔ اور جس طرح قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسولؐ) دوسرے قول یعنی قرآن کو منسوخ کر دیتا ہے۔" (صـ۸۶)

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے چنانچہ ان کے نزدیک قرآن کی بہت سی آیات ہیں جنہیں یا تو قرآن کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیا ہے یا حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔ اب ان آیات کی صرف تلاوت ہوتی ہے۔ ان پر عمل نہیں ہوتا۔

قرآن مکمل دین نہیں

ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اصولی طور پر بھی قرآن کریم دین کا مکمل ضابطہ نہیں۔ حدیث کی صحیح پوزیشن "مثلہٗ معہٗ" ہے۔ یعنی قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔ مودودی صاحب اس باب میں فرماتے ہیں۔

"حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر یہ مراد ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے۔ یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آگیا ہے۔ اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے۔ تو یہ دعوے واقعہ کے خلاف ہے..... مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔"

(ترجمان القرآن۔ جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۵۰)

اس مقام پر مودودی صاحب سے یہ پوچھا گیا کہ جب دین کی تکمیل قرآن اور حدیث، دونوں کے مجموعے سے ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں، قرآن ہی میں کیوں نہ بیان کر دیا تاکہ اُمّت کے پاس دین کا مکمل اور محفوظ ضابطہ موجود ہوتا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ

"اس سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلوپیڈیا کے برابر ضخیم ہو جاتا اور وہ تمام فوائد باطل ہو جاتے جو اس کتاب کو محض ایک مختصر سی اصولی کتاب رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔"

(تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صـ ۳۳۷)

یوں "دین کے ایک غیر متبدل، ابدی حصہ" کو قرآن سے باہر احادیث کے اندر رکھ دیا گیا اور احادیث کے مجموں سے اسے تلاش کرنے کا طریقہ "مزاج شناس" کی نگہ بصیرت کے سپرد کر دیا گیا۔

یہ ہے، برادران عزیز! حدیث کی پوزیشن ہمارے علمائے کرام کے اپنے الفاظ میں۔ ہم نے ہر اقتباس کے ساتھ حوالہ نقل کر دیا ہے تاکہ یہ نہ کہہ دیا جائے کہ ہم نے کچھ اپنی طرف سے لکھ دیا ہے یا توڑ مروڑ کر پیش کر دیا ہے۔ آپ ان حوالوں سے اصل عبارت نکال کر دیکھ لیں اور سیاق و سباق سے ملا کر اپنا اطمینان کر لیں۔

اتنا اور واضح کر دیا جائے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ سنّی حضرات کا عقیدہ ہے۔ شیعہ حضرات سنیوں کی آحاد کے مجموعوں کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان کی احادیث کے اپنے مجموعے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ایک مستفسر کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"آپ کو جو اس بات پر تعجب ہے کہ آخر واضح احادیث کی موجودگی میں وہ (شیعہ حضرات) کیونکر اپنی ہٹ پر قائم رہ سکتے ہیں تو آپ کو یہ تعجب غالباً اس غلط فہمی کے سبب سے ہے کہ آپ سمجھتے

ہیں کہ حدیث کی جن کتابوں کو آپ مستند و معتبر مانتے ہیں یہ حضرات بھی ان کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ذہن میں یہ خیال رکھتے ہیں تو اس خیال کو ذہن سے نکال دیجئے۔
ان حضرات کی حدیث و فقہ، ہر چیز کے اپنے مجموعے ہیں جو ان کے اپنے خاص ذرائع سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ انہی کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ ان مجموعہ ہائے احادیث کو یہ کوئی وزن نہیں دیتے جو ہمارے ہاں معتبر ہیں"۔ (میثاق بابت مئی ۱۹۶۷ء)

ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ان حضرات کا یہ کہنا کہ دیکھئے! ہم نے متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے کہ آئینِ پاکستان کی بنیاد کتاب و سنّت پر ہونی چاہیئے، اس لئے اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں اتنے فرقے موجود ہیں اور فرقوں میں اس قدر باہمی اختلاف ہے۔ اس لئے ہم متفق علیہ اسلامی آئین کس طرح بنا سکتے ہیں۔ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ یہ حضرات یہ کہہ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اس مشکل مسئلہ کو یوں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ "سنّت" کے معاملہ میں ان کے باہمی اختلافات بنیادی ہیں اور جس بات کو ایک فرقہ یا فرد سنّت قرار دیتا ہے، دوسرا اسے "سنّت" سمجھتا ہی نہیں۔ یعنی ان کا اس بنیاد پر بھی اتفاق نہیں کہ "سنّت" کہتے کسے ہیں؟ اور وہ کس کتاب میں ہے یہ حضرات اس وقت تو لیپا پوتی سے کام لے سکتے ہیں لیکن جب کل عملاً یہ سوال سامنے آیا کہ فلاں قانون مطابق سنّت ہے یا نہیں؟ تو اس "متفق علیہ" مطالبہ کی قلعی کھل جائے گی۔ اس وقت ان میں سے ہر ایک کا فیصلہ الگ الگ ہوگا۔ ان حضرات کو اس حقیقت کا خود احساس ہے۔ اس کا انہوں نے یہ حل سوچا ہے کہ آئین میں یہ شق رکھ دی جائے کہ شخصی قانون (PERSONAL LAW) میں قرآن و سنّت کی تعبیر وہی لی جائے جو متعلقہ فرقے کے نزدیک قابلِ قبول ہو (ہم اس سوال کو ذرا آگے چل کر سامنے لائیں گے کہ قرآن کی رُو سے شخصی اور ملکی قانون کی تفریق ہی غلط ہے۔ سرِ دست یہ دیکھئے کہ، اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شخصی قانون کی صورت میں ہر فرقہ کی الگ الگ تعبیر قابلِ قبول ہو گی تو ملکی قانون کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا۔ اس لئے کہ کتاب و سنّت کی مطابقت کی شرط ملکی قانون پر بھی اسی طرح عاید ہو گی جسطرح شخصی قانون پر۔ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں ملکی قانون مطابقِ سنّت ہے یا نہیں جبکہ ملک کے سامنے سنّت کی کوئی جامع تعریف یا کتاب ہی نہیں ہو گی ان حضرات نے یہ مطالبہ پیش کر کے کہ شخصی قانون میں ہر فرقہ کی "کتاب و سنّت کی الگ الگ تعبیر تسلیم کر لی جائے۔ اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ کتاب و سنّت سے شخصی قوانین بھی ایسے نہیں بنائے جا سکتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوں۔ اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کتاب و سنّت سے شخصی قوانین بھی متفق علیہ نہیں بن سکتے (یعنی کتاب و سنّت کی رُو سے نکاح اور طلاق وغیرہ سے متعلق

شخصی قانون

قوانین بھی ایسے نہیں بن سکتے جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہوں، تو اسی کتاب و سنت کی رُو سے متفق علیہ ملکی قوانین کس طرح بن سکیں گے؟ حضرات علمائے کرام نے نہ اپنے سابقہ مطالبہ میں اس کی تصریح فرمائی تھی اور نہ اب ہی اس کے متعلق اشارۃً تک کیا ہے؟

یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق یہ حضرات آئین جیسے اہم اور پیچیدہ مسئلہ کی اس بنیادی شق سے یوں آنکھیں بند کر کے گزر جانا چاہتے ہیں۔ اور جو شخص حقائق کا سامنا کرنے کے بعد ان سے دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا حل کیا ہے اس کے متعلق شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں باادب گذارش کریں گے کہ اس قسم کی ہنگامہ آرائی سے ایسے اہم مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ یہ آئین کا بنیادی مسئلہ ہے جس کا حل آپ کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے۔ اگر آپ حضرات، طلوعِ اسلام کو گالیاں دینے کے بجائے، اس تمام عرصہ میں

کرنے کا کام

(۱) "سنتِ رسول اللہ" کی ایسی تعریف (DEFINITION) مرتب کر دیتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوتی۔ اور

(۲) کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر دیتے جس میں پوری کی پوری سنت رسول اللہ درج ہوتی اور اس کتاب کا متن سب کے نزدیک قرآن کے متن کی طرح متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہوتا۔ پھر بھی آپ کہہ سکتے کہ ہم نے ایک متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے لیکن جب حقیقت یہ ہو کہ مطالبہ پیش کرنے والے اس خشتِ اوّل ہی پر متفق نہ ہوں کہ سنت کہتے کسے ہیں اور وہ کہاں سے ملے گی تو ان کے مطالبہ کو متفق علیہ کہنا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ کچھ دیکھ کر آپ یقیناً سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گے اور بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی آئین مرتب ہو ہی نہیں سکتا، وہ سچے ہیں۔ ۱۹۵۶ء کا آئین جسے اسلامی کہہ دیا گیا تھا ایک دن بھی نہیں چل سکتا تھا۔ اور اگر اب پھر اسی قسم کا آئین بنا دیا گیا تو وہ بھی ایک دن نہیں چل سکے گا۔ لہٰذا کشود کی راہ یہی ہے۔ کہ ان خاردار جھاڑیوں سے الگ رہتے ہوئے جس طرح باقی دنیا اپنا اپنا آئین بناتی ہے، ہم بھی ویسا ہی آئین بنا لیں۔ اسلامی آئین کا جو تصور ہمارے علمائے کرام پیش کرتے ہیں، اس

سیکولر آئین

کے پیشِ نظر کوئی شخص مندرجہ بالا نتیجہ کے سوا کسی اور نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ علمائے کرام کا یہی انداز تھا جس سے تنگ آ کر ترکی کو سیکولر آئین اختیار کرنا پڑا تھا۔ اور یہی وہ وقت ہے جس کا حل سامنے نہ ہونے سے پاکستان میں سیکولر آئین کی آوازیں کان میں پڑتی ہیں۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ صحیح اسلامی آئین، جو حقائق کی روشنی میں قابلِ عمل ہو، مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا اسے مرتب کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ آئین کے معاملہ میں اسلام کا منشاء

مسئلہ کا حل

کیا ہے۔ طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کا منشاء یہ تھا کہ اسلامی آئین کی بنیاد قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر رکھی جائے جن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مملکت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کاروبار چلائے۔ علمائے کرام کا کہنا یہ ہے کہ آئین کی بنیاد کتاب و سنت یا قرآن اور حدیث پر رکھی جائے اور دونوں کو غیر متبدل اور ابدی قرار دیا جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے ساتھ احادیث کو بھی دین کا ابدی اور غیر متبدل حصہ قرار پانا تھا تو

(۱) کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ضروری نہیں تھا کہ جس طرح اس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لیا تھا۔ احادیث کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا۔ اور

(۲) کیا نبی اکرمؐ کا یہ فریضۂ رسالت نہیں تھا کہ آپؐ قرآن کے ساتھ اپنی احادیث کا مجموعہ بھی اُمت کو دے کر جاتے تاکہ یہ دونوں چیزیں اُمت کے پاس متفق علیہ طور پر ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتیں اور اس قسم کا کوئی اُلجھاؤ پیدا نہ ہوتا جو حدیث کے بارے میں گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آیا ہے؟ جب رسول اللہؐ نے ایسا کوئی مجموعہ اُمت کو نہیں دیا تو اس سے انسان لامحالہ دو نتیجوں میں سے کسی ایک پر پہنچتا ہے یعنی

منشائے نبویؐ

(ا) یا تو (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) حضورؐ سے سہواً یہ کام رہ گیا۔

(ب) اور یا حضورؐ نے دانستہ ایسا کیا۔

پہلے نتیجہ کا تو کوئی مسلمان تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے دوسری بات ہی باقی رہتی ہے کہ منشائے رسالتؐ ہی یہ تھا کہ اُمت قرآن کریم کی راہ نمائی میں آگے چلے۔ چنانچہ واقعات خود اسکی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً

"(۱) مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ مجھ سے نہ لکھو اور جس شخص نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو وہ اُسے مٹا دے۔" اس سے ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ نے صرف قرآن کریم کی کتابت کرائی تھی۔ احادیث کو لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔ خود یہ واقعہ کہ حضورؐ نے احادیث کا کوئی مجموعہ اُمت کو نہیں دیا اس کا بیّن ثبوت ہے کہ حضورؐ نے احادیث کی کتابت نہیں کرائی تھی۔

(۲) بخاری میں حضرت عبدالعزیز بن رفیع سے روایت ہے کہ میں اور شداد بن معقل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر شداد بن معقل نے ان سے دریافت کیا، کیا آنحضرتؐ نے کوئی چیز چھوڑی تھی؟ انہوں نے جواب دیا آپ نے مابین الدفتین (یعنی مجلد قرآن کریم) کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا۔ عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں محمد بن حنفیہؓ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بھی یہی بات دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ "آپ نے مابین الدفتین کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا۔"

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد قرآن کریم

(کتابی) شکل میں نہیں تھا۔ اسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں جمع اور مرتب کیا گیا تھا۔ تو یہ خیال خود قرآن کریم کے واقعات کے خلاف ہے۔ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم اسی شکل میں جس میں وہ اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔ اُمّت کو دیا تھا۔ اور قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز اُمّت کو نہیں دی تھی۔

خلفائے راشدینؓ کا عمل

نبی اکرمؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ کا زمانہ آتا ہے۔ اس دور کے متعلق علامہ محمد الخضری مصری (مرحوم) اپنی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی (اردو ترجمہ شائع کردہ دار المصنفین) میں لکھتے ہیں۔

"۳۔ حافظ ذہبی نے تذکرہ الحفاظ میں مراسیل ابن ابی ملیکہ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہؐ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں تم لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے اور تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا۔ تو حضورؐ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔" (صـ ۱۶۱)

اس کے بعد حضرت عمرؓ کا زمانہ آتا ہے۔ اس کے متعلق علامہ خضری لکھتے ہیں۔

"۴۔ سیوطی نے تنویر الحوالک شرح مؤطا امام مالکؒ میں ایک روایت میں جس کا سلسلہ حضرت عروہ بن زبیرؓ تک منتہی ہوتا ہے۔ یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے احادیث کو لکھوانا چاہا اور اس بارے میں اصحاب رسول اللہؐ سے مشورہ کیا تو تمام صحابہؓ نے اس کا مشورہ دیا۔ لیکن وہ ایک ماہ تک خود غیر متیقن طور پر اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک دن انہوں نے یقینی رائے قائم کرلی اور فرمایا کہ میں نے، جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ تم سے تحریر احادیث کا ذکر کیا تھا۔ پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ تم سے پہلے اہل کتاب میں سے بہت سے لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ اور کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کتابوں میں مشغول ہوگئے۔ اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہیں کروں گا۔ اس لیے انہوں نے تحریر احادیث کا کام چھوڑ دیا۔" (صـ ۱۶۳)

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ صورت یہ نہیں کہ عہد رسالت مآبؐ اور دور خلافت راشدہؓ میں جمع و تدوین احادیث کا کام سہواً رہ گیا تھا۔ اور بعد میں امام بخاریؒ نے اسے پورا کر کے دین کے اہم ایک جزو کو محفوظ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے اسے دین کا ابدی جزو قرار ہی نہیں دیا تھا۔ اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اسے ایسا سمجھا تھا۔ یہ خیال بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر دین کا ابدی اور غیر متبدل حصہ ہوتا تو عہد رسالت مآبؐ اور زمانہ خلافت راشدہؓ میں اسے محفوظ کیوں نہ کر دیا جاتا؟ نبی اکرمؐ نے اُمّت کو قرآن کریم

ہی دیا تھا اور اسی پر اسلامی مملکت (خلافتِ راشدہ) نے اپنے "آئین کی بنیاد رکھی۔ اس لئے کہ جیسا کہ مودودی صاحب نے بھی لکھا ہے۔

قرآن کی پوزیشن

"دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں"۔ (تفہیمات۔ جلد اوّل۔ صـ۳۳۹)

وہ رسائل و مسائل میں لکھتے ہیں۔

"یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارتاً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ **ان علینا للھدیٰ**"۔ (صـ ۶۷)

وہ اپنی تفسیر، تفہیم القرآن (صـ۵۹۸) میں لکھتے ہیں۔

"حرام اور حلال ..... جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا۔ اور انسانی زندگی کے لیے قانون اور شرع تجویز کرنا، یہ سب خداوند ہی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لیے تسلیم کرنا شرک ہے"۔

اس حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات حصہ دوئم (صـ۳۸۹) میں لکھتے ہیں۔

"اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابوداؤد نے سلمان فارسیؓ سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ۔ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ۔ "حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہی وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تو وہ معاف ہیں"۔

قرآنِ کریم کا اندازِ بیان ایسا صاف۔ سیدھا اور واضح ہے کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں۔

"قرآن کریم اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کے لیے ضروری تھا واضح کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے"۔

(ترجمان القرآن۔ بابت اپریل۔ مئی ۱۹۵۲ء)

قرآن کے سمجھنے کے لیے کسی تفسیر کی بھی ضرورت نہیں۔

"قرآن کے لیئے کسی تفسیر کی بھی حاجت نہیں۔ اس کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔"

(تنقیحات - صہ ۱۹۳)

قرآن کو خود قرآن سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی فرماتے ہیں۔

"قرآن کے اندر اسرارِ حکمت کا لاریب ایک خزانہ ہے۔ لیکن اس خزانہ کی کلید خود قرآن ہی کے ارشادات و الفاظ ہیں۔ قرآن سے باہر ان کی کلید نہیں۔ قرآن کے علوم کا ایک حصہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک حصہ اس کے اشارات سے کھلتا ہے۔ ایک بہت بڑا حصہ اس کے سیاق و سباق سے بے نقاب ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑا خزانہ اس کے نظام کی معرفت سے سامنے آتا ہے۔ جو لوگ قرآن پر تدبّر کرتے ہیں وہ بقدرِ استعداد اس سے فیض پاتے ہیں وہ اپنی ہر بات پر قرآن ہی کے الفاظ و اشارات اور سیاق و نظام سے دلیل لاتے ہیں۔"

(ترجمان القرآن - بابت فروری ۱۹۵۲ء)

دین کی جزئیات

اب اس سلسلہ میں ہمارے سامنے وہ اہم سوال آتا ہے جو اکثر ذہنوں کے لیئے پریشانی کا موجب بنتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے اکثر و بیشتر دین کے اصول دیے ہیں ان کی جزئیات متعیّن نہیں کیں۔ یہ جزئیات نبی کریمؐ نے متعیّن فرمائیں۔ اگر سنت رسول اللہؐ کو آئین کی بنیاد نہ قرار دیا جائے تو ان جزئیات کو کہاں سے لیا جائے گا؟

اس سلسلہ میں غور طلب نقطہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جب دین کے صرف اصول دیئے اور ان کی جزئیات کو خود متعیّن نہیں کیا، تو کیا اس نے دانستہ کیا تھا یا یہ (معاذ اللہ) سہواً رہ گیا تھا؟ اس سوال کا جواب ہم سے نہیں، بلکہ مودودی صاحب کی زبانِ قلم سے سنئے۔ وہ اپنی تفسیر، تفہیم القرآن (جلد اوّل) کے صفحات صہ ۵۰۸۔ ۵۰۷ پر لکھتے ہیں:

"ایک دوسری حدیث میں ہے۔ ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ "اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے انکے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی ہے۔ لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔

ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے جن امور کو شارع نے مجملاً

بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی یا جو احکام بر سبیل اجمالی دیئے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہوگئی تفصیلات بتانی چاہئیں تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے اب جو شخص خوامخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعینات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصل، مطلق کو مقید، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے (یہودیوں نے ایسا ہی کیا) جن کے نقش قدم پہ چلنے میں قرآن اور محمد صلعم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔"

یعنی اگر اللہ تعالےٰ نے ان اصولوں کی جزئیات و تفصیلات خود نہیں بتائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "وہ ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔ اور احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے"۔ خدا کی آخری کتاب کے لیے جسے اقوام عالم کے لیے، ہر ملک اور ہر زمانے میں ہمیشہ ضابطۂ حیات بننا تھا، ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا اس میں زندگی کے ایسے اصول دینے چاہئیں تھے جو ہر زمانے میں نوع انسان کے لیے راہنمائی کا کام دے سکیں اور ان کی جزئیات کو چھوڑ دینا چاہیئے تھا تاکہ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان جزئیات کو خود مرتب کریں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے اور ان کی چار دیواری کے اندر مرتب کردہ جزئیات میں حسب ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی۔ اس طرح ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے کاروانِ انسانیت زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا۔ علامہ اقبالؒ اس ضمن میں اپنے خطبات (تشکیل جدید) میں رقمطراز ہیں۔

جزئیات غیر متبدل نہیں ہوتیں

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں متنقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرلے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔۔۔۔۔ لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے بکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ

کو حکمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر متبدّل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔"

قرآنِ کریم کے ان غیر متبدّل اصولوں کی جزئیات سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب فرمائیں۔ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل رکھا جانا، نہ مقصودِ دین تھا نہ منشائے رسالتؐ۔ یہ وجہ تھی کہ حضورؐ نے ان جزئیات کو مدوّن کر کے ان کا مجموعہ اُمت کو نہ دیا۔ اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ایسا کیا۔ اس کے برعکس، ہمیں تاریخ میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں، خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ان جزئیات میں ردّ و بدل کیا گیا۔ (طلوعِ اسلام اس باب میں اس سے پہلے اسقدر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ اس مقام پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات ان تفاصیل کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ "اسلام میں قانون سازی کا اصول" دیکھ لیں) علامہ اقبالؒ اس باب میں لکھتے ہیں۔

"احادیث کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا گیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔

اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالم گیر اصول عطا کر دے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر

کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے۔ اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطورِ خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا ان حالات کی روشنی میں، میں بھی سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقننن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اسکا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔" (خطباتِ اقبال صفحہ ۱۶۴-۱۶۳)

نبی اکرمؐ کے زمانے کے احکام میں تغیّر و تبدّل کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب اور جزئیات دین

"یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجے کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالتؐ اور عہد صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں لہٰذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں۔ ان کو ہوبہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا ردّوبدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روح اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔۔۔ پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصول تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔"

(تفہیمات حصہ دوم۔ صٓ ۳۲۷)

وہ اسی کی تفصیل میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

"مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہر اشکال میں مماثلت پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دین دار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلفِ صالح کی پیروی اس کا نام ہے کہ۔ تمدن وحضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ

اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط ہے درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقار کو روکنے کی کوشش کرتی رہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقار کو غلط راستوں سے روک کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے کہ ہم کو "خیرِ اُمّۃ" جو بنایا گیا ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ ہم ارتقار کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر REAR GUARD کی حیثیت میں لگے رہیں۔ بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے "خیرِ اُمّۃ" ہونے کا راز "اخرجت للناس" میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہؐ اور آپؐ کے اصحابؓ کا اصلی اسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہئے یہ ہے کہ انہوں نے قوانینِ طبعی کو قوانینِ شرعی کے تحت کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی۔ پس نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن کے ارتقار اور قوانین طبعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اسی طرح تہذیبِ اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدرِ اوّل میں کی گئی تھی۔ نجاست اور گندگی جو کچھ ہے وہ ان وسائل میں نہیں ہے بلکہ اس کافرانہ تہذیب میں ہے جو ان وسائل سے فروغ پا رہی ہے۔" (نشانِ راہ۔ صہ ۵۵)[1]

---

[1] ۔ اس وقت اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ حوالہ میں کچھ فرق رہ گیا ہو۔

دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ "عبادات" کے علاوہ دیگر احکام کی جزئیات ہم خود متعین کر سکتے ہیں۔

"اب رہ گئے احکام، تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضورؐ سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں مثلاً عبادات کے احکام اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہد نبویؐ کے قوانین مدنی اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں۔ دنیا کے علمی اور عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق وہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہیے۔"

(تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صہ ۳۳۲)

طلوعِ اسلام کی دعوت

طلوعِ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ آئینِ پاکستان کی اساس و بنیاد قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کو قرار دیا جائے اور ان اصولوں کی جزئیات مرتّب کرتے وقت ہم اس تمام ذخیرہ کو اپنے سامنے رکھیں جو اسلاف سے ہم تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اس میں جو کچھ ایسا ہو جو ہماری ضروریات کو آج بھی پورا کرتا ہے اسے علیٰ حالہ رہنے دیا جائے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو اس میں تبدیلی کر لی جائے اور جو نئے معاملات سامنے آئیں ان کے لئے نئی جزئیات مرتّب کر لی جائیں۔

مودودی صاحب اس باب میں لکھتے ہیں۔

"اب اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو صحابہ یا ائمہ کے دور میں پیش نہیں آیا، یا کوئی ایسی چیز ایجاد ہوتی ہے جو اس دور میں موجود ہی نہ تھی تو اس کے متعلق متقدمین کے اجتہادی احکام میں کوئی حکم تلاش کرنا بداہتہً غلط ہے۔ ایسے ہر حادثے اور ہر چیز کے لئے ہم کو بھی اسی طرح اصول و کلیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس طرح صحابہؓ اور ائمہؒ نے اپنے عہد کے حوادث میں کیا تھا۔"

(تفہیمات حصہ دوم صہ ۳۸۷)

مولانا اصلاحی کا مسلک یہ ہے کہ قرآن ہی میں نہیں بلکہ حدیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں اور جزئیات کا تعین امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"قرآن وحدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اور اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات وتفصیلات سے ان میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ اس خلاء کو حالات وضروریات کے تحت بھرنا نیز تمام پیش آنے والے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام کی منشاء اور مزاج کیمطابق قوانین بنانا امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔" (ترجمان القرآن - اپریل ۱۹۵۴)

نگۂ بازگشت

سنتِ رسول اللہ کے متعلق جو کچھ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ :-

(۱) "سنت کسے کہتے ہیں" اس کے متعلق یہ حضرات آپس میں متفق نہیں۔

(۲) ایسی کوئی کتاب نہیں جس میں سنتِ رسول اللہ بہ تمام وکمال درج ہو اور جس کا متن، تمام مسلمانوں کے نزدیک، قرآن کریم کے متن کی طرح، متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو۔ حتیٰ کہ حدیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۳) مولانا اسماعیل صاحب (اور ان کے ہم مکتب علمائے اہل حدیث) کا مسلک اور عقیدہ یہ ہے کہ دین کی جزئیات بھی خدا کی طرف سے بذریعہ وحی رسول اللہ کو عطا ہوئی تھیں۔ یہ جزئیات احادیث کے مجموعہ، بخاری و مسلم میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے کسی حدیث کا انکار بھی کفر ہے اور کسی نئی بات کا اختیار کرنا بدعت۔ اسی کا نام "سنت رسول اللہ" ہے۔

(۴) مودودی صاحب کے نزدیک، ہر حدیث سنت نہیں۔ سنت وہ ہے جسے رسول اللہ نے بہ حیثیت رسول فرمایا یا کیا ہو۔ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسول کی نگہِ بصیرت کر سکتی ہے کہ احادیث کی کتابوں میں جو کچھ آیا ہے اس میں کون سی حدیث صحیح اور کون سی غلط ہے۔ اور صحیح حدیثوں میں سے کون سی بات نبی اکرم نے بہ حیثیت رسول کی تھی اور کون سی اپنی شخصی حیثیت سے۔ جو باتیں حضور نے بہ حیثیت رسول کی تھیں انہیں بھی بجز عبادات کے ہو بہو قائم رکھنا مقصود نہیں۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے اور نئے حوادث کے سلسلہ میں جدید جزئیات بھی مرتب کی جا سکتی ہیں۔ اور

(۵) مولانا اصلاحی صاحب کے نزدیک، قرآن وحدیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنا امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے جو جزئیات رسول اللہ نے مرتب فرمائی تھیں۔ ان میں سے سنت وہ ہیں جنہیں حضور نے استمراراً کیا ہو۔ ہنگامی حالات میں وقتی قضیوں کے فیصلے کے طور پر ارشاد نہ فرمایا ہو۔ اس کا فیصلہ (کہ حضور نے کون سی بات استمراراً کی تھی اور کون سی ہنگامی حالات

کے ماتحت) غالباً خود اصلاحی صاحب یا ان کے ہم مسلک حضرات کریں گے۔

"سنّت" کے مفہوم کے متعلق اس قدر باہمد گر اختلافات کے باوجود، ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ ہم نے آئینِ پاکستان کے متعلق متفقہ مطالبہ پیش کر دیا ہے! اصل یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک قدرِ مشترک صرف لفظ "سنّت" ہے، اس کا مفہوم ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے۔ اگر طلوعِ اسلام چاہتا تو وہ بھی نہایت دھڑلے سے کہہ دیتا کہ آئینِ پاکستان کی بنیاد واقعی کتاب وسنّت پر ہونی چاہئے اور جب کوئی پوچھتا تو مودودی صاحب کی طرح، کہہ دیتا کہ ہمارے نزدیک سنّت وہی ہے جسے ہماری نگہِ بصیرت سنّت کہہ دے اس طرح ان حضرات سے "سنّت" کے مطالبہ کی ہمنوائی سے وہ بھی انہی کی طرح "حامیٔ سنّت" قرار پا جاتا اور اس کے خلاف کوئی طوفان برپا نہ ہوتا۔ لیکن طلوعِ اسلام دین کے معاملہ میں اس قسم کے کھیل کھیلنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس لئے اللہ ہر ایک کو محفوظ رکھے۔

مولانا اسماعیل صاحب سے ایک سوال

اس مقام پر ہم (مثلاً جماعت اہلِ حدیث کے نمائندہ) مولانا اسماعیل صاحب سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ اس وقت تو آپ مطمئن ہیں کہ (مثلاً) مودودی صاحب نے "کتاب وسنّت" کے مطالبہ میں آپ سے اتفاق کر لیا ہے۔ لیکن کل کو اگر پاکستان میں کوئی قانون نافذ ہوا اور اس کے متعلق سوال پیدا ہوا کہ آیا وہ قانون "سنّت" کے مطابق ہے یا نہیں اور مودودی صاحب نے اسناد سے بے نیاز ہو کر اپنی نگہِ بصیرت کے مطابق ایک حدیث پیش کر دی تو کیا آپ اس حدیث کو صحیح حدیث تسلیم کر لیں گے اور اسے "سنّت" قرار دے دیں گے۔؟

مودودی صاحب سے بھی

یہی سوال ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر اس وقت مولانا اسماعیل صاحب نے بخاری کی کوئی حدیث پیش کر دی تو کیا آپ اسے صحیح حدیث تسلیم کر لیں گے اور اسے واجب الاطاعت "سنّت رسولؐ اللہ" قرار دے دیں گے؟

یہی سوال مختلف فرقوں کے ان نمائندوں سے پوچھا جا سکتا ہے جنہوں نے اس متحدہ مطالبہ پر دستخط کئے ہیں کہ کیا وہ اس وقت کسی دوسرے فرقے کی طرف سے پیش کردہ حدیث کو تسلیم کر لیں گے؟

آپ حضرات کی طرف سے اس سوال کے جواب کے لئے طلوعِ اسلام کے صفحات کھلے ہیں۔

اس کے برعکس، اگر قرآن کریم کو آئین کی بنیاد قرار دیا جائے اور اس وقت کسی فرقے کی طرف سے قرآن کی کوئی آیت پیش کی جائے تو کوئی فرقہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ قرآن کی آیت نہیں۔

قرآن کی تعبیر میں اختلاف

اس مقام پر یہ کہہ دیا جائے گا کہ قرآن کی آیت کے قرآنی آیت ہونے میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی تعبیر میں تو اختلاف ہوگا؟ چونکہ اس سوال کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے (بلکہ یوں کہیے کہ اسے یہ کہہ کر اچھالا جاتا ہے کہ اگر قرآن کریم کو قانون کی بنیاد قرار دے لیا تو اُمت میں جو کچھ رہا سہا اتحاد باقی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا) اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق ذرا وضاحت سے بات کی جائے۔

(۱) قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کے لئے ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ سورۃ النساء میں ہے

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝ (۴/۸۲)

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت اختلافات پاتے"۔

اس سے ظاہر ہے کہ دو مختلف باتوں کو قرآن کریم سے سند یا تائید مل ہی نہیں سکتی۔

(۲) اس نے کہا ہے کہ وہ آیا ہی اختلافات مٹانے کے لئے ہے۔

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ ۙ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔ (۱۶/۶۴)

"اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے لئے وہ باتیں واضح طور پر بیان کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں (یوں) یہ قرآن ان لوگوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے جو اسکی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں"۔

(۳) وہ تاکید کرتا ہے کہ جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس کے لئے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرو تمہیں وہاں سے حتمی فیصلہ مل جائے گا۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰)

"اور تم جس بات میں بھی اختلاف کرو، تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہے"۔

(۴) اس کی رُو سے اختلاف خدا کا عذاب ہے۔ اس نے جماعتِ مومنین سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ (۳/۱۰۵)

"اور تم نے ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے (خدا کی طرف سے) واضح ہدایت آجانے کے بعد باہمی تفرقہ اور اختلاف کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے۔"

قرآن کریم کے ان واضح اعلانات کے بعد یہ کہنا کہ اگر ہم نے قرآن کو آئین و قوانین کی بنیاد قرار دے لیا تو اس سے اختلافات بڑھ جائیں گے، قرآن کے دعوے سے کھلا ہوا انکار ہے۔ اور اپنے تفرقہ اور اختلافات پر مصر رہنا، اپنے آپ کو عذاب خداوندی میں مبتلا رکھنا ہے۔

قرآن فہمی کا طریقہ

قرآن نے اپنے سمجھنے کے لئے خود ہی اصول بیان کر دیئے ہیں (ان اصولوں کی طرف مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنے اس مضمون میں اشارہ کیا ہے جس کا اقتباس پہلے دیا جا چکا ہے)۔ اگر قرآن کریم کو، خود قرآن کریم سے، اس کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے احکام و قوانین کو سمجھنے میں اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ جو آپ اس وقت مختلف فرقوں میں اختلاف دیکھتے ہیں تو اسکی وجہ یہ نہیں کہ قرآن کریم ان میں سے ہر ایک کو اس کے مسلک کی تائید بہم پہنچا رہا ہے اگر ایسا ہو تو قرآن کے منجانب اللہ ہونیکا دعوے ہی (معاذ اللہ) باطل قرار پا جائے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مختلف فرقے، قرآن کریم کو خارج از قرآن چیزوں کے تابع رکھتے ہیں۔ یعنی یہ فرقے اپنے لئے احکام و قوانین کو خارج از قرآن سرچشموں سے لیتے ہیں۔ اسکے بعد وہ قرآن کی طرف آتے ہیں۔ اگر انہیں ان احکام و قوانین کی تائید میں قرآن کریم کی کوئی آیت مل جاتی ہے تو اسے بھی تائیداً ساتھ رکھ لیتے ہیں اگر قرآن کی آیت اس کے خلاف جاتی ہے تو اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اس حکم کے مطابق دکھائی دے۔ اگر ایسا کرنا ناممکن ہو تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کا حکم منسوخ ہے۔ آپ اصحاب حدیث کا یہ عقیدہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ باقی رہے اہل فقہ (حنفی حضرات) تو ان کے پیشوا اور مسلم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ کا یہ قول ان کے عقیدے کو واضح کرتا ہے کہ

فقہ اور قرآن

"ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ ہے اور اسطرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماوّل یا منسوخ ہے۔" (علامہ الخضریؒ۔ ص ۴۲۱)

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ جس چیز کو قرآن کی تعبیر میں اختلاف کہا جاتا ہے وہ درحقیقت قرآن کی تعبیر کا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ جن چیزوں کو مختلف فرقوں نے قرآن پر قاضی اور حاکم بلکہ اس کا ناسخ قرار دے رکھا ہے وہ ان چیزوں کا اختلاف ہوتا ہے۔ اور یہ اختلاف ہوتا ہے فرقوں کی باہمی ضد کی وجہ سے۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ ..... (۴۵/۱۷)

"اور ہم نے انہیں اس معاملہ (دین) کے متعلق واضح باتیں دی تھیں۔ لیکن انہوں نے العلم (وحی) آجانے کے بعد آپس میں اختلاف کیا۔ اور اس اختلاف کی وجہ محض ان کی باہمی ضد تھی۔"

اگر فرقہ بندی کی باہمی ضد کو الگ رکھ کر، اُمّت خالص قرآن کی طرف آجائے تو اس کے احکام و قوانین[1] میں کسی قسم کا اختلاف نہیں رہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے زندگی کیلئے جو ضابطہ عطا فرمایا ہے اگر وہ بھی صاف، واضح اور متعین نہیں تو پھر اس کے اس دعوے کا (معاذ اللہ) کچھ مطلب ہی نہیں کہ وہ نورِ انسان کے لئے صاف۔ واضح۔ مکمل۔ واحد اور آخری ضابطہ حیات ہے۔

فرقہ اہلِ قرآن

بعض لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ فرقہ اہلِ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآنِ خالص سے احکام متعین کرتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی باہمی اختلاف ہے۔ ایسا کہنے والوں کو دراصل اس کا علم نہیں کہ فرقہ اہلِ قرآن نے کونسی باتیں قرآن سے متعین کرنیکی کوشش کی اور ان میں باہمی اختلاف ہوا؟ قرآن نے جن امور کو محض اصولی طور پر بیان کیا ہے۔ یہ فرقہ ان کی جزئیات کو بھی قرآن سے متعین کرنے لگ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جو باتیں قرآن میں ہوں ہی نہ، اگر کوئی انہیں بھی قرآن سے متعین کرنے بیٹھ جائے تو ان میں اختلاف نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ جو لوگ یہ متعین کرنا چاہیں کہ قرآن کی رُو سے (مثلاً) رکوع میں کون سی تسبیح پڑھنی چاہیئے، ان میں اختلاف کے سوا اور کیا ہوگا۔ فرقہ اہلِ قرآن کی یہی بنیادی غلطی تھی جسکی وجہ سے وہ خود ناکام رہا اور اس کی وجہ سے قرآن بدنام ہو گیا قرآن نے زندگی کے جو اصول و احکام دیئے ہیں، وہ صاف اور واضح ہیں۔ جن جزئیات سے وہ خاموش رہا ہے ان کے متعلق اسکی تعلیم

---

[1] قرآنِ کریم میں زندگی کے لئے اصول قوانین اور احکام بھی ہیں اور حقائقِ کائنات اور مابعد الطبیعاتی امور بھی۔ جہاں تک اصول قوانین و احکام کا تعلق ہے انہیں قانون کی زبان میں بیان کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کے ابہام یا ذو معنی ہونے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جہاں تک کائناتی حقائق وغیرہ کا تعلق ہے انہیں قرآن نے تشبیہات و استعارات کی زبان میں بیان کیا ہے کہ جوں جوں انسانی علم میں وسعت آتی جائے ان کا مفہوم واضح سے واضح تر ہوتا جائے مثلاً قرآن میں ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (۴/۲۳) "تم پر تمہاری مائیں حرام قرار دی گئی ہیں"۔ یہ حکم بالکل واضح اور متعین ہے۔ اس میں صرف یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ ماؤں سے مراد حقیقی مائیں ہیں۔ یا سوتیلی مائیں بھی اسکے اندر آجاتی ہیں۔ اس کیلئے اس سے ماسبق آیت میں کہہ دیا کہ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۲۲) ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں۔ اسنے بات صاف کر دی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ہے کہ انہیں اُمت باہمی مشورے سے مرتب کرے۔ اس طریق کو اختیار کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہے؟ اس دعوی کا زندہ ثبوت خود عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ ہے جس میں اس طریق کو اختیار کیا گیا اور اُمت میں کوئی اختلاف (یا فرقہ) پیدا نہ ہوا۔

اور اگر یہ واقعہ بھی ہو کہ فرقہ اہلِ قرآن۔ یا کسی اور کو قرآن کریم کے کسی حکم کے سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے تو کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح کر سکے اور اس میں اختلافی باتیں موجود ہیں۔ اس سے تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان ہی نہیں رہتا۔ بہرحال اتنا واضح ہے کہ قرآن کی صورت میں یہ سوال سامنے نہیں آئے گا کہ فلاں آیت قرآن کی ہے یا نہیں لیکن حدیث کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جس چیز کو حدیث کہہ کر پیش کیا جارہا ہے وہ رسول اللہ کی حدیث ہے بھی یا نہیں۔ اس کے مفہوم کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے فرقوں کے اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن باتوں کو ایک فرقہ صحیح احادیث قرار دیتا ہے دوسرا فرقہ انہیں صحیح حدیثیں سمجھتا ہی نہیں۔

شخصی قوانین

اب رہا حضرات علمائے کرام کا یہ مطالبہ کہ جہاں تک شخصی قوانین (RERSONAL LAWS) کا تعلق ہے "ہر مسلمہ فرقہ" کو اجازت ہو کہ وہ کتاب و سنّت کی تعبیر اپنے عقیدے کے مطابق کرے اس باب میں گذارش ہے کہ کیا یہ حضرات کتاب اللہ یا سنّت رسول اللہ سے (جسے بھی وہ اپنے عقیدہ کے مطابق سنّت سمجھتے ہوں) اس امر کا اشارہ تک بھی پیش کر سکتے ہیں کہ اسلام شخصی قوانین اور ملکی قوانین میں تفریق کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصور اس دور میں پیدا ہوا جب سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا گیا ملکی قوانین اہلِ سیاست نے اپنے پاس رکھے اور شخصی قوانین کو مذہبی پیشوائیت کی طرف

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) دوسری طرف یہ آیت لیجئے کہ کان عرشہ علی الماء (۱۱/۷) اس آیت کا تعلق احکام سے نہیں بلکہ حقائق سے ہے اس کا لفظی ترجمہ ہے "اس کا عرش پانی پر ہے"۔ اگر ان الفاظ کے عام معنی مراد لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ بادشاہوں کے تختوں کی طرح خدا کا بھی ایک تخت ہے اور وہ پانی پر تیرتا ہے لیکن اگر انکے مجازی معنی لئے جائیں تو عرش سے مراد خدا کا اقتدار اور کنٹرول ہوگا یانی رہا ماء تو اسکے متعلق قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ جعلنا من الماء کل شیئ حی (۲۱/۳۰) "ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا" تو اسکا مطلب ہوگا زندگی کا سرچشمہ اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ زندگی کے سرچشمہ پر کنٹرول خدا کا ہے۔ یہ مثال ہے حقائق سے متعلق قرآن کے انداز کی حقائق کے سمجھنے میں علیٰ قدرِ علم اختلاف ہو سکتا ہے قوانین و احکام میں نہیں حقائقِ کائنات کے سمجھنے میں اختلاف سے مملکت میں انتشار نہیں پیدا ہوتا انتشار اسوقت پیدا ہوتا ہے جب مختلف فرقے اپنے لئے الگ قوانین تجاویز کرلیں۔ ایسی صورت میں انتشار تو ایک طرف، مملکت قائم ہی نہیں رہ سکتی۔

منتقل کردیا۔ ہندوستان میں جب انگریزوں کی حکومت آئی تو انہوں نے مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اس کے مطابق انہوں نے ملک کے قوانین اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی معاملات، قانونِ شریعت کے مطابق طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں، ہمارے ہاں ملکی اور شخصی قوانین کی تفریق زندہ رہی۔ اب خدا کے فضل سے ہماری اپنی آزاد مملکت ہے جس کے لئے اسلامی آئین کی تدوین کا سوال زیرِ غور ہے۔ اس مملکت میں ہمارے علمائے کرام اس ثنویت کو برقرار رکھنے اور مستحکم کرنے کی کوششیں فرما رہے ہیں جو دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی اور انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں پروان چڑھی! یا للعجب!

اس ثنویت میں مودودی صاحب تو اس حد تک آگے نکل گئے ہیں کہ ان کے نزدیک نماز۔ روزہ وغیرہ تو دین سے متعلق ہیں اور معاشی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی مسائل کا براہِ راست دین سے تعلق ہی نہیں چنانچہ وہ تفہیمات حصہ اول ص۲۸۷ پر لکھتے ہیں۔

"مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپؐ کے اتباع کا عام حکم دینے سے یہ مراد نہیں کہ آپؐ نے جو کچھ کیا اور جس طرح کیا، لوگ بھی بعینہٖ وہی فعل اسی طرح کریں۔ اور اپنی زندگی میں آپؐ کی حیاتِ طیبہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد نہ قرآن کا ہے۔ نہ ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں، مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور براہِ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپؐ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے مثلاً نماز، روزہ، حج۔ زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپؐ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازمی ہے۔ رہے وہ امور جو براہِ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے مثلاً تمدنی۔ معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے ہم کو مکارمِ اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے اور ہم آپ کے طریقے کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپؐ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لئے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپؐ کا اتباع

طابق النعل بالنعل ہونا چاہیئے اور کن امور میں آپؐ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کر کے قوانین وضع کرنے چاہئیں اور کن امور میں آپؐ کی سنّت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہئیں"۔

فرقوں کا وجود

باقی رہا فرقوں کا وجود، تو قرآن کریم نے بالفاظِ صریح اسے شرک قرار دیا ہے۔ اس نے مسلمانوں سے تاکیداً کہا کہ دیکھنا! تم نے مسلکِ توحید اختیار کرنے کے بعد کہیں مشرک نہ ہو جانا:

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۲-۳۲)

"تم نے مشرکوں میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے (پھر حالت یہ ہو گئی کہ) تمام فرقے اپنے اپنے مسلک پر اترا رہے ہیں"۔

اس نے نبی اکرمؐ سے برملا کہہ دیا کہ

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

"وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور وہ گروہ بن گئے۔ (اے رسولؐ) تیرا ان سے کچھ واسطہ نہیں"۔

ان نصوصِ صریحہ کی موجودگی میں، فرقوں کی گروہوں کو آئینی طور پر مضبوط کرانے کی کوشش کرنا، آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ کیا کہلائیگی۔ ہمیں تسلیم ہے کہ آج ہم میں فرقے موجود ہیں۔ اسے بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقے شبا شب نہیں مٹ سکتے۔ اس لئے ان کے وجود کو سردست، اضطراری طور پر گوارا کرنا ہی پڑے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم جسقدر جلد ممکن ہو، اس "مشرکانہ حالت" سے نکل کر موحدانہ منزل میں پہنچ جائیں اس کے لئے اولین قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم آئینی طور پر، اُمّت میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا کرنے کی تجاویز عمل میں لائیں اور اپنا نصابِ تعلیم اس انداز کا مرتب کریں کہ ہماری آنے والی نسلیں، خود بخود تفرقہ کی حالت کو چھوڑ کر اُمّت کی وحدت میں گم ہو جائیں۔ اس وقت نہ شخصی اور ملکی قوانین کی تفریق باقی رہے گی۔ نہ عبادات اور معاملات میں فرق کیا جائے گا۔ ایک خدا کی کتاب۔ ایک اُمّت اور ایک نظامِ زندگی۔ اسے کہیں گے اسلامی معاشرہ!

فرقوں کے وجود کو بامرِ مجبوری علی حالہٖ رہنے دینے سے مطلب یہ ہے کہ جس جس طریق سے کوئی فرقہ اپنے ہاں نماز وغیرہ ادا کرتا ہے اس میں سردست دخل نہ دیا جائے۔ یاد رہے کہ اسلام میں عبادات اور معاملات میں کوئی فرق نہیں۔ "عبادت" کے معنی احکامِ خداوندی کی اطاعت ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے ہاں مختلف فرقوں نے

"عبادت" (بمعنی پرستش) کے طور طریقوں کو اپنا امتیازی نشان قرار دے رکھا ہے اس لئے جب تک فرقوں کا وجود برداشت کیا جائے گا اس وقت تک ان کی عبادت کے طور طریق سے بھی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ تاآنکہ کچھ وقت کے بعد، ہماری آنے والی نسلیں خود محسوس کر لیں کہ دین میں اس تفریق کی قطعاً اجازت نہیں۔ اس وقت نماز کا بھی ایک ہی طریقہ ہوگا اور جس طرح قرنِ اوّل میں ہوتا تھا امام، خود مملکت کے سربراہ ہوں گے۔ طلوعِ اسلام کی یہ دعوت بھی کچھ نئی نہیں۔ وہ پہلے دن سے اعلان کرتا چلا آ رہا ہے کہ

"اُمّت کے مختلف فرقے نماز روزہ وغیرہ میں جس جس طریق پر عمل پیرا چلے آ رہے ہیں اس میں ردوبدل کرنے کا حق کسی فرد کو نہیں"۔

خود طلوعِ اسلام نے نماز کا کوئی نیا طریقہ وضع نہیں کیا۔ کوئی نئی فقہ ایجاد نہیں کی۔ اس نے مملکت کے آئین کے بارے میں جو کہا ہے کہ اس کی بنیاد قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر ہونی چاہیئے تو اس لئے کہ وہ ان حقائق سے چشم پوشی نہیں کر سکتا جن کا ذکر سابقہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

آپ حضرات سے ہماری دردمندانہ گذارش ہے کہ آپ بھی ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ جن مختلف الخیال لوگوں نے "کتاب وسنّت" کے مطالبہ پر متفقہ طور پر دستخط کئے ہیں (یا جو بعد میں ان کے ہم نوا بنیں گے) جب ملک میں قانون سازی کا وقت آئے گا تو اس وقت یہ کس طرح ایک دوسرے کے مدِمقابل نہیں کھڑے ہوں گے۔ جس حنفی عالم کی آج کیفیت یہ ہے کہ وہ (مثلاً) اہلِ حدیث کے مسنون طریقہ کے مطابق نماز پڑھنے کے لئے تیار نہیں کیا وہ اس کے لئے تیار ہو جائے گا کہ جس ملکی قانون کو اہلِ حدیث مطابق سنّت قرار دیں، اسے وہ بھی قانونِ شریعت تسلیم کر لے؟ اُس وقت اگر اربابِ حل وعقد نے یہ کہہ دیا کہ آپ حضرات کی اس چپقلش سے ملک کے نظم ونسق کی گاڑی آگے نہیں چل سکتی اس لئے ہم ملکی قوانین کو آپ کے چنگل سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں تو سوچیے کہ اس طرح ملک پر نافذ ہونے والے سیکولر نظام کی ذمّہ داری کس پر عاید ہوگی؟ اربابِ حل وعقد کو فرنگی مآب یورپ زدہ، مادہ پرست کہہ دینا بہت آسان ہے لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ ایسے حالات میں اور کیا کیا جا سکے گا۔ محض "کتاب وسنّت" کا مطالبہ کر دینے سے آپ حضرات اپنے فریضہ سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ذرا یہ بھی تو بتلایئے کہ اس کے مطابق ملک کی قانون سازی کی عملی شکل کیا ہوگی؟

نماز کی متفق علیہ شکل

جب یہ حقیقت ہے کہ انیس (چھوڑ، انیس سو) علماء بھی، اور تو اور، نماز تک کی کوئی متفق علیہ مسنون شکل بھی متعین نہیں کر سکتے، تو سوچیے کہ سنّت کے مطابق ملک کا متفق علیہ قانون کس طرح سے بن سکے گا؟ ان حالات میں پاکستان میں اسلامی آئین وقوانین کی

ترتیب کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم کو جس کے متن کے متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہونے میں کسی کو کلام نہیں

پس چہ باید کرد؟

مملکت کی بنیاد قرار دیا جائے اور اس کے احکام و قوانین کی تعبیر میں، خارج از قرآن کسی چیز کو قرآن پر حاکم اور قاضی نہ تصور کیا جائے یہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ہماری تمام مشکلات کس طرح حل نہیں ہوتیں۔ اس لئے کہ مودودی صاحب کے الفاظ میں)

"دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔

(۲) جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسانی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے اور وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو اشارۃً وکنایۃً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) حرام اور حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا یہ سب خداوند ہی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔" (۵)

اور، اس سے تو امید ہے کہ آپ بھی متفق ہوں گے کہ جو قانون قرآن کریم کے مطابق ہوگا وہ سنت رسول اللہؐ کے بھی عین مطابق ہوگا۔

دعا کیجئے کہ تاریخ کے اس نازک ترین دور میں اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے اپنے تعصبات میلانات اور رجحانات سے الگ ہو کر، ٹھنڈے دل سے حقائق کا جائزہ لیں اور ایسی صورت نہ پیدا ہونے دیں جس سے بر فرد جسد اسلام ہمیں یہ کہہ کر مطعون کرے کہ تمہاری ضد کی وجہ سے مملکتِ پاکستان میں میرا استقرار نہ ہو سکا۔

خریدار صاحبان متوجہ ہوں!

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں

پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔

پھر سُن لیجئے!

چونکہ یہ مقالہ طویل ہوگیا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ جو نکات شروع میں بیان کئے گئے ہیں آخر تک پہنچتے پہنچتے وہ آپ کے ذہن میں منتشر نہ رہے ہوں۔ اس بنا پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اسے مختصر الفاظ میں دہرا دیا جائے تاکہ ساری بات بیک وقت آپ کے ذہن میں آجائے۔ ان مختصر الفاظ کو غور سے پڑھئے گا۔

(۱) اس وقت پاکستان کے لئے جدید آئین مرتب کرنے کا سوال زیر غور ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے۔

(۲) ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو چاہتا ہے کہ یہاں کا آئین "سیکولر انداز کا ہو"۔ "سیکولر انداز" کے معنی یہ ہیں کہ مملکت جس قسم کے قوانین وضوابط مناسب سمجھے بنالے۔ اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو

(۳) طلوعِ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی آئین نافذ ہونا چاہئے۔ "اسلامی آئین" کے معنی یہ ہیں کہ مملکت ان حدود کے اندر رہتی ہوئی تمام کاروبار انجام دے جو اسلام نے عاید کی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ حدود کون سی ہیں۔

(۴) طلوعِ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جو حدود قرآن کریم نے مقرر کی ہیں۔ مملکت انہیں سے باہر نہ جاسکے۔

(۵) قرآن کریم وہ کتاب ہے جو حرفاً حرفاً وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی اکرمؐ کو دیا اور جسے نبی اکرمؐ نے اُمّت کو دیا۔ قرآن کریم کے متن کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔ یعنی جب قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کی جائے تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ قرآن کی آیت نہیں ہے۔ اگر قرآن کریم کو مملکت کا حاکم اعلیٰ قرار دیا جائے تو اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا۔

(۶) ہمارے علمائے کرام کا مطالبہ ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ "سنّت" کو بھی مملکت کا حاکم اعلیٰ قرار دیا جائے۔ بظاہر یہ مطالبہ بہت خوش آئند دکھائی دیتا ہے اور جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مطالبہ ممکن العمل بھی ہے۔

(۷) سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ "سنّت" کہتے کسے ہیں؟ آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ جن علمائے کرام نے اس مطالبہ پر دستخط کئے ہیں وہ خود بھی اس سوال کے جواب پر متفق نہیں کہ سنت کسے کہتے ہیں؟

ایک کا کہنا ہے کہ:

نبی اکرمؐ نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا یا ارشاد فرمایا۔ یا جس کام کو دیکھ کر آپؐ خاموش رہے۔ وہ سب سنّت ہے دوسرے کا کہنا ہے کہ:

نہیں۔ رسول اللہؐ نے جو کچھ بحیثیت رسولؐ کیا تھا صرف وہ "سنّت" ہے جو کچھ آپؐ نے شخصی حیثیت سے

کیا تھا، وہ سنت میں داخل نہیں۔

تیسرے کا خیال ہے کہ

جو کچھ رسول اللہؐ نے دواماً یا التزاماً کیا ہے، وہ سنت ہے جو کچھ وقتی طور پر یا کسی ہنگامی معاملہ کے لئے تصفیہ کے لئے کیا تھا، وہ سنت میں داخل نہیں۔

(۸) پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ سنت رسول اللہؐ پر بعینہٖ عمل کیا جانا ضروری ہے یا اس میں حالات کے مطابق تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک:

"سنت رسول اللہؐ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی"۔

دوسرے کا خیال ہے کہ:

عبادات میں تو سنت رسول اللہؐ کا من وعن اتباع ضروری ہے لیکن معاملات میں، اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

(۹) اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ سنت رسول اللہؐ ملے گی کہاں سے؟ ایک کا کہنا ہے کہ:

بخاری اور مسلم شریف میں جو کچھ ہے وہ سب صحیح ہے۔ جبریل امین اسے بھی قرآن کی طرح لیکر نازل ہوئے تھے۔ ان کتابوں کے اندر مندرج احادیث میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں جو شخص ان کا انکار کرتا ہے وہ کفر کا مرتکب ہے۔

دوسرے کا خیال ہے کہ:

یہ غلط ہے۔ یہ کتابیں انسانوں سے انسانوں تک پہنچی ہیں۔ ان میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور غلط بھی۔ صرف صحیح حدیثوں کو مانا جائے گا غلط کو نہیں۔

(۱۰) اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ صحیح اور غلط حدیثوں کی پرکھ کس طرح سے ہو۔ ایک اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ حدیثوں کی پرکھ اس سے پہلے ہو چکی ہے۔ آئمہ سلف نے جن احادیث کو صحیح قرار دیدیا ہے وہ سب صحیح ہیں۔ اب ان پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔

دوسرا کہتا ہے کہ

یہ غلط ہے۔ آئمہ بھی ہماری طرح کے انسان تھے۔ وہ بھی غلطی کر سکتے تھے اس لئے ان کی پرکھ ہمارے لئے حرف آخر نہیں ہو سکتی۔ ہم خود ان کی پرکھ کریں گے۔ پوچھا گیا کہ ان کی پرکھ کا طریقہ کیا ہے؟ جواب ملا کہ: اسلام کا گہرا مطالعہ کرنے سے انسان میں اس قسم کی نگاہ پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ میں فوراً امتیاز کر لیتا ہے۔ اس قسم کے جوہری کی نگاہ بتا سکے گی کہ صحیح حدیث کون سی ہے اور غلط کون سی؟

(۱۱) سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر قرآن اور حدیث میں اختلاف نظر آئے تو اس وقت عمل کس پر کیا جائے؟
جواب ملا کہ اس وقت عمل حدیث پر کیا جائے گا کیونکہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

(۱۲) ایک اور گروہ کا عقیدہ ہے کہ:

قرآن کی آیت ہو یا حدیث رسول اللہ! اگر وہ ہمارے آئمہ کے کسی قول کے خلاف ہو تو اس آیت یا حدیث کی یا تو تاویل کی جائے گی اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اسے منسوخ سمجھا جائے گا۔

(۱۳) اس ساری بحث کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ

کیا کتاب وسنّت دونوں کو ساتھ رکھنے سے یہ ممکن ہوگا کہ سارے ملک کے لئے متفق علیہ قانون مرتب کر لیا جائے۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ:

ایسا ممکن نہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ قانون کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ ایک شخصی اور دوسرا ملکی قانون۔ جہاں تک شخصی قانون کا تعلق ہے ہر فرقے کو اجازت دی جائے کہ وہ کتاب وسنّت کی تعبیر اپنے اپنے مسلک کے مطابق کرے۔

(۱۴) اس سے لازمی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ شخصی قانون کے لئے تو کتاب وسنّت کی تعبیر ہر فرقہ کی اپنی اپنی تسلیم کر لی جائے۔ لیکن ملکی قوانین کے لئے کتاب وسنّت کی کون سی تعبیر تسلیم کی جائے اس کا جواب غالباً یہ دیا جائے گا کہ جس تعبیر کو تمام فرقے متفقہ طور پر صحیح قرار دیں اسے تسلیم کیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ جب شخصی قانون جیسے معاملے میں تمام افراد کتاب وسنّت کی متفقہ تعبیر پیش نہیں کر سکتے تو ملکی قوانین کی صورت میں وہ ایسا کس طرح کر سکیں گے؟

(۱۵) یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ

(۱) جب قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے تو پھر فرقہ بندی کی گرہوں کو آئینی طور پر مضبوط کرتے جانا، کس طرح اسلام کے مطابق ہوگا۔ اور

(۲) کیا قرآن کریم یا سنّت رسول اللہ نے شخصی اور ملکی قوانین میں فرق کیا ہے؟

(۱۶) اس مسئلہ کا دوسرا غور طلب پہلو یہ ہے کہ:

(۱) یہ واقعہ ہے کہ نبی اکرم نے احادیث کا کوئی مجموعہ اُمت کو نہیں دیا۔ آپ نے صرف قرآن ہی اُمت کو دیا۔
(۲) خلفائے راشدینؓ نے بھی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا بلکہ جب یہ سوال پیش ہوا تو انہوں نے پورے غور وخوض کے بعد فیصلہ کیا کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے اس کے برعکس انہوں نے

قرآن کریم کی نشر و اشاعت میں اس قدر سرگرمی کا ثبوت دیا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں قرآن کریم کے کم از کم ایک لاکھ نسخے مملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔

(iii) احادیث کے موجودہ مجموعے، نبی اکرمؐ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد، انفرادی کوششوں سے مرتب ہوئے اور دوسرے لوگوں نے انفرادی طور پر ان کے پرکھنے کی کوشش کی۔ جن احادیث کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے ان کے ساتھ نہ خدا کی سند ہے نہ خدا کے رسولؐ کی کہ وہ ارشادات واقعی رسول اللہ کے ہیں)۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر احادیث کو قرآن کی طرح، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اطاعت کا ضابطہ بننا تھا تو رسول اللہ نے ان احادیث کا مجموعہ مرتب کرا کر امت کو کیوں نہ دیا تاکہ امت میں احادیث کے بارے میں اس قدر انتشار اور اختلاف نہ ہوتا۔ اس سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دیتا۔

(۱۷) ان حالات پر غور کرنے سے انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کا منشاء یہی تھا کہ قرآن کریم کو امت کے لئے ضابطۂ اطاعت قرار دیا جائے۔

(۱۸) طلوعِ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ آئینِ پاکستان کی بنیادی شق یہ رکھی جائے کہ:

مملکت اپنا تمام کاروبار قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کرے اور ملک میں کوئی قانون ایسا نہ بنے جو قرآن کے خلاف ہو۔ ظاہر ہے کہ جو قانون قرآن کے خلاف نہیں ہوگا وہ سنت رسول اللہ کے بھی خلاف نہیں ہوگا۔

(۱۹) اگرچہ اسلام میں عبادات اور معاملات میں کوئی فرق نہیں لیکن جس حالت میں ہم آج ہیں، اس میں، بامرِ مجبوری، عبوری دَور کے لئے ہر فرقہ کو اجازت ہوگی کہ وہ عبادات کو اپنے اپنے طریق کے مطابق ادا کر لیا کرے۔

(۲۰) اگر اس طریق کے مطابق ہمارا آئین مرتب ہو جائے تو ہم اس منزل کی طرف پہلا قدم اٹھا سکیں گے جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا اور علمائے کرام کا یہی اختلاف قائم رہا تو قانون سازی کی گاڑی ایک قدم نہیں چل سکے گی۔ اس سے خطرہ ہے کہ مملکت کے اربابِ حل و عقد تنگ آ کر یہ نہ کہہ دیں کہ تم شخصی قانون کو کتاب و سنت کی اپنی اپنی تعبیر کے مطابق طے کرتے رہو۔ ملکی قانون کو ہم آزادانہ مرتب کریں گے۔ اسی کا نام سیکولر حکومت ہوتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود ہی سوچئے کہ طلوعِ اسلام نے جو مطالبہ پیش کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟

بابُ المراسلات

۱۔ ذیل کا مراسلہ، جو صاحبِ مراسلہ نے صدرِ مملکت کے نام بھیجا ہے، ہمیں محترم اعزاز الدین صاحب کی طرف سے موصول ہوا ہے جسے ہم بلا تبصرہ شائع کر رہے ہیں۔ ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام - کونسا اسلام

("اللہ کا الدِّین - الاِسلام" یا "ہمارے آئین کا اسلام")

۳۰ مئی ۱۹۸۸ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے، صدرِ محترم نے قومی اسمبلی توڑنے کی ایک وجہ یہ بتائی کہ اس نے نفاذِ اسلام کے عمل کو سرد خانے میں ڈال دیا تھا۔ بقول صدر صاحب "سب سے بڑا ظلم تو یہ ہوا کہ نفاذِ اسلام کا کام پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ نئے اقدامات تو درکنار پہلے سے کیے گئے اقدامات کو بھی سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔" انہوں نے قوم کو یاد دلایا کہ "پاکستان صرف اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا۔ اور اسلام کے نام پر ہی قائم رہے گا۔ جس کے لئے اسلامی نظام اشد ضروری ہے۔" انہوں نے قوم کو یقین دلایا کہ "نفاذِ اسلام کے عمل کو از سرِ نو تازہ کرنے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اقدامات اُن کی حکومت کی ترجیحات میں سرِ فہرست رہیں گے۔" اپنے خطاب کے آخر میں صدرِ محترم نے فرمایا "اسلام کے ساتھ میری لگن اور نفاذِ اسلام کے لئے میری تڑپ کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ مجھے اس میں کامیابی نصیب فرمائے۔"

صدرِ محترم کا اسلام کے ساتھ گہرا لگاؤ یقیناً ایک خوش آئند بات ہے۔ اللہ اس جذبے کو اور زیادہ کرے۔ آمین یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ آٹھ سال تک، سیاہ و سفید کے مالک ہونے کے باوجود، صدر صاحب اپنی "لگن اور تڑپ" کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ اور یہ سوال بھی غور و فکر کا متقاضی ہے کہ مارشل لاء کے دور میں، اسلامائیزیشن کے سلسلے میں، نافذ کردہ آرڈیننسز ــــ حدود، زکوٰۃ، عشر، صلوٰۃ اور دیگر اقدامات ــــ توقعات پر پورے کیوں نہیں اُترے؟ یہاں

اب بھی قتل و غارت، ڈاکے، چوریاں، اغوا، زنا، رشوت، ملاوٹ، گروہی، صوبائی و لسانی تعصّبات اور اس قسم کے منکرات عام ہیں۔ بلکہ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے برائی کو برائی سمجھنے کا احساس ہی ختم ہو گیا ہو۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا اسلام کے زرّیں اصول بے اثر ہو چکے ہیں؟ (نعوذ باللہ)۔ یا ہم نے اسلام کو "بازیچۂ تاویل" بنا کر اس کے اصولوں کو بے اثر کر دیا ہے؟ اپنی منزل کی صحیح سمت متعین کرنے کے لیے ان سوالات پر کھلے ذہن سے غور و فکر وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اب اس خلفشار، جو قومی اسمبلی توڑنے کا باعث بنا، کے اسباب اور علل معلوم کرنے کے لیے کمیٹیاں بٹھائی گئی ہیں۔ لیکن ہماری یہ کمیٹیاں اس قسم کے حالات کے سطحی اسباب کے گرداب میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ دریا کی گہرائی میں اتر کر، بنیادی اور اساسی علت واصل تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اگر اس انداز سے تحقیق کی جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ؎

تماشا ایک ہی ہے تم اسے جس دور میں دیکھو
وہی بھولی ہوئی منزل، وہی بھٹکے ہوئے راہی

منزل کا تعیّن

صدر صاحب نے بالکل صحیح فرمایا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس مملکت کو اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ اسلام بحیثیت دین (نظامِ زندگی) اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اگر آزاد مملکت نہ ہو تو یہ صرف مذہب کی شکل میں باقی رہ سکتا ہے۔ ہندوستان میں، اسلام مذہب کی حیثیت میں باقی رہ سکتا تھا۔ دین کی شکل اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دین کی صورت میں متشکل کرنے کے لیے ہم نے ایک آزاد مملکت کے حصول کا مطالبہ کیا۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی مملکت کا حصول جس میں اسلام ایک عملی نظامِ حیات کی شکل میں کارفرما ہو۔ یہ تھی ہماری منزل جسے ہم پاکستان بننے کے بعد بھول گئے۔ اور اب تک بھولے ہوئے ہیں۔ جب تک ہم اپنی بھولی ہوئی منزل کو متعین طور پر سامنے نہیں لائینگے، تب تک نہ کارواں اپنے مستقر تک پہنچ سکتا ہے۔ نہ متاعِ کارواں، رہزنوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

اسلام۔ کونسا اسلام

ظاہر ہے کہ جس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اس کی منزل و مستقر کا تعین قرآنِ عظیم کی قندیلِ درخشاں کے سوا اور کونسی روشنی کر سکتی ہے۔ لیکن یہ ہماری کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ اس "قندیلِ درخشاں" کے ہوتے

ہوئے بھی ہم انتشار اور خلفشار کا شکار ہیں۔ کیوں؟ یہ اس لئے کہ ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے۔ ہم بات تو اللہ کے دین ۔ اسلام ۔ کی کرتے ہیں لیکن عملی طور پر نافذ اس اسلام کو کرتے ہیں جس میں مذہبی فرقے ہیں اور ہر ایک فرقے کی علیحدہ علیحدہ "قرآن و سنت" ہے۔ یعنی ہر ایک فرقے کا علیحدہ علیحدہ اسلام ہے۔ یقین نہ آئے تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آرٹیکل نمبر ۲۰ (ب) اور آرٹیکل نمبر ۲۲۷ (الف) کے وضاحتی نوٹ کو دیکھ لیں۔ آپ دیکھیں گے کہ دستور میں دیا گیا اسلام، اللہ کے اسلام کی ضد ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو ایک جماعت (ملّتِ واحدہ) بنایا ہے۔ اس جماعت میں الگ الگ فرقوں اور پارٹیوں کا وجود قرآنِ حکیم کے واضح الفاظ میں شرک ہے۔ اور ایسا کرنے والے مشرکین ہیں $\frac{30}{31\text{-}32}$۔ جن سے اللہ اور رسول کا کوئی واسطہ نہیں رہتا $\frac{6}{160}$۔ قرآن حکیم کے اس کھلے ہوئے فیصلے کے بعد، ہم صدر صاحب سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ جب وہ اسلام کی بات کرتے ہیں تو کونسے اسلام کی بات کرتے ہیں۔ دستور میں دیئے گئے "اسلام" کی یا اللہ کے دین ۔ اسلام ۔ کی۔

ہمارے "دستور" کا اسلام

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے پہلا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ اسلامی قوانین کس طرح وضع کئے جائیں۔ ہمارے علماء کرام نے مطالبہ کیا کہ اس مقصد کے لیے آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہوگا۔ یہ مطالبہ ناممکن العمل تھا۔ کیونکہ کتاب و سنّت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تھا۔ جو تمام مذہبی فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اس پر ان حضرات نے یہ ترمیم کی کہ پرسنل لاز ہر فرقے کے الگ الگ ہوں اور پبلک لاز کا مجموعہ کتاب و سنّت کے مطابق مدوّن کر لیا جائے۔ کسی نے نہیں سوچا کہ اوّل تو پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق خود کتاب و سنّت کے خلاف ہے۔ نہ قرآنِ حکیم نے ان میں کوئی تخصیص کی ہے اور نہ ہی عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں ان میں کوئی تفریق تھی۔ دوسرے یہ کہ کتاب و سنّت کے مطابق پبلک لاز کا بھی کوئی ایسا ضابطہ مدوّن نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ ان حالات میں چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ کی کتاب ۔ القرآن ۔ کی طرف رجوع کیا جاتا اور اس کی روشنی میں آئین ترتیب دیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہماری اعلیٰ سیاسی قیادت نے علمائے کرام کے متضاد اور غیر قرآنی مطالبوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور دستور (آئین) میں ایک ایسا اسلام رکھ دیا جو سیاسی لیڈران کی سیاسی ضروریات تو پورا کرتا ہے، منشائے خداوندی پورا نہیں کرتا۔ دستور کے آرٹیکل نمبر ۲۲۷ (الف) کے وضاحتی نوٹ پر نظر ڈال لیجئے، بات واضح ہو جائے گی۔ یہ آرٹیکل انگریزی میں یوں ہے:-

PART IX

227. PROVISIONS RELATING TO THE HOLY QURAN AND SUNNAH:

(1) All existinglaws shall be brguoht in conformity wilk the injuctions of
ISLAM as laid down in the Holy Quran and Sunnah, in this part ref-
erred to as the injunctions of Islam, and no law shall be enacted
which is repugnant to such injunctions.
[Explanation:- In the application of this clause to the
personal law of any Muslim sect, the expression "Quran
and Sunnah" shall mean the Quran and Sunnah as inter-
pretted by that sect.]

اسس آرٹیکل (نمبر ۲۲۷ (الف) وضاحت) میں ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ "قرآن وسنت" کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا، اور دوسری طرف، اسی آرٹیکل کی وضاحت میں، قرآنِ حکیم کے واضح احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مذہبی فرقوں کا نہ صرف امت میں وجود تسلیم کرلیا گیا ہے بلکہ پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور ہر فرقے کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ پرسنل لاز کی حد تک، اپنی اپنی "قرآن وسنت" کے مطابق عمل کرسکتے ہیں!!

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق کا تصوّر یکسر غیر قرآنی اور خلاف اسلام ہے۔ الاسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جس میں عقائد، عبادات، باہمی معاملات، امورِ مملکت، پرسنل اور پبلک لاز وغیرہ سب باہم گرپوست، بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں۔ ان میں تفریق شرک ہے۔ وحدتِ خالق کا عملی ظہور وحدتِ اُمّت (بلکہ وحدتِ انسانیت) کی شکل میں ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا جس طرح الوہیت کے ٹکڑے کرنا شرک ہے اسی طرح وحدتِ امّت کو پارہ پارہ کرنا بھی شرک ہے۔ اُمت کی وحدت کی بنیاد ایک اللہ کے ایک ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے۔ اُمّت میں تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف فرقے، اپنی زندگی مختلف ضوابط کے ماتحت بسر کرتے ہیں، اور یہ شرک ہے۔

ہمیں قرآنِ حکیم کا یہ انقلاب آفریں اعلان بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ اسے ضابطہ، قوانین، اختیارِ حکمرانی، حتیٰ کہ نبوّت بھی کیوں نہ حاصل ہو۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے احکام کی تعمیل کرو۔" (۳/۷۸)۔ مذہبی فرقوں کے بارے میں قرآنی احکام نہایت واضح ہیں (۳۰/۳۱-۳۲)، (۶/۱۶۰)۔ اب آپ ہی کہیے ہمیں فرقوں کے بارے میں کس کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے۔ اللہ کے آئین (القرآن) کی یا انسان کے بنائے ہوئے آئین کی (یعنی ہمارے آئین کی)!؟

ایک اسلامی مملکت قرآنی قوانین کے نفاذ کی عملی شکلیں اور طریقِ کار کی جزئیات تو مرتّب کرسکتی ہے، لیکن اُسے

1 added by Constitution (Third Ammendment) Order 1980, w.e.f. Sept. 17. 1980

یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بعض احکام قرآن سے لے لے اور دوسرے احکام باہر سے، اور اس مرکب کا نام اسلامی قوانین رکھ لے۔ قرآن کی رُو سے ایسا کرنا سنگین جرم ہے۔ اور دنیا اور آخرت میں تباہی کا موجب ہے (۲/۸۵-۸۶) لیکن ہم کرہی رہے ہیں۔ اور اس طرح اپنی تباہی کو دعوت دے رہے ہیں۔ ہمیں مہلت کے وقفے سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور اپنی روش دُرست کرنی چاہیئے۔ روش تبھی درست ہو سکتی ہے جب ہمیں اپنے مسئلہ کا علم ہو۔ یعنی ہمیں علم ہو کہ ہماری پرابلم (Problem) کیا ہے؟

الاسلام کا واضح تصوّر متعین کریں

پروفیسر وائٹ ہیڈ نے کہا ہے کہ اگر کسی پرابلم (Problem) (مسئلہ) کو (Define) کر دیا جائے تو، اس سے آدھا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ہماری پرابلم — ہمارا مسئلہ — یہ ہے کہ ہمارے سامنے اللہ کے دین کا واضح تصوّر نہیں ہے۔ آج اگر کوئی صاحبِ دَرد، اس اُمّتِ منتشرہ میں وحدت پیدا کرنے کے لیے اٹھے تو اس کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ وہ اسلام کے بنیادی تصوّرات کا مفہوم متعین کرے جس کی طرف یہ اُمّت اپنے آپ کو (لفظاً ہی سہی) منسوب کرتی ہے۔ اس کے سوا مسلمانوں میں وحدت تو ایک طرف اتحاد پیدا کرنے کی بھی کوئی صورت ممکن نہیں۔ وحدتِ فکر وہ بنیاد ہے جس پر وحدتِ عمل کی عمارت استوار ہوتی ہے اور اسی وحدتِ فکر و عمل کا نام اُمّت کی وحدت ہے۔

اسلام ایک نظامِ زندگی ہے، جس کی بنیادیں چند محکم اور غیر متبدّل تصوّرات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ بنیادی تصوّرات، واضح غیر مبہم اور متعین طور پر سامنے نہ آئیں یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ وہ نظامِ زندگی ہے کیا جسے اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور جو زندگی کے اہم مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان تصوّرات کی، جنہیں اسلام کی بنیاد کہہ کر پیش کیا گیا ہے، سند کیا ہے؟ اس کا جواب آسان ہے۔ قرآنِ حکیم اسلام کا ضابطۂ قوانین ہے۔ دین اس کے اندر مکمل اور محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا، اسلامی تصوّرات وہ ہیں جن کی سند قرآنِ حکیم سے مل جائے۔ اتنا پھر کہوں گا کہ جب تک دین کے بنیادی تصوّرات کا متفق علیہ مفہوم متعین نہیں ہوتا، اُمّت میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اُمّتوں کی وحدت، ان کے افراد کے قلب و نظر کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہماری مسلمان قوم تو فرقوں میں بٹ پڑی ہے۔ اس کا علاج کیسے ممکن ہو؟ اس میں وحدتِ فکر و عمل کیسے پیدا ہو؟ اس نے تو الدّین کو مذہب بنا دیا ہے!

اُمّت میں وحدت کیسے پیدا ہو؟

اسلام کا صحیح تصوّر متعین کرنے کے لیئے یہ جاننا ضروری ہے کہ الاسلام دین ہے۔ مذہب نہیں۔ جب اپنی

مملکت نہ ہو، یا مملکت تو ہو لیکن اس میں الاسلام کو بطور نظامِ حیات اختیار نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں اسلام دین نہیں رہتا' (عام اصطلاح میں) مذہب بن جاتا ہے۔ مذہب کا لفظ قرآن میں نہیں آیا اس لیے کہ الاسلام میں مذہب کا تصور ہی نہیں۔ مذہب میں اسلام یا دین سے مفہوم لیا جاتا ہے، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق جسے بندگی یا دیگر رسوم و مناسک کی ادائیگی کے ذریعے قائم کیا جاتا ہے۔ اس وابستگی کا تعلق محض عقیدہ سے ہوتا ہے' اس سے زیادہ اس کی حقیقت کچھ نہیں ہو سکتی۔ مذہبی پیشوائیت دین کے اس پیکرِ بے روح اور جسدِ بے جان کو قائم رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ محض فریبِ تخیل ہوتا ہے جو قرآنی حقائق کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ مذہب ہر حکومت ہر مملکت میں پنپتا رہتا ہے۔ اور حکومتیں (بالعموم) اس کی آزادی دیدیتی ہیں۔ ہمیں انگریز کی حکومت میں بھی مذہبی آزادی حاصل تھی اور اب ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لیکن کوئی حکومت دین کی آزادی نہیں دے سکتی کیونکہ دین تو اپنی آزاد مملکت قائم کرتا ہے۔ اسلام، بحیثیت الدّین کے اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں۔ ہر جگہ (خواہ وہ مسلمانوں کی اپنی سلطنتیں ہوں یا مسلمان، غیر مسلموں کے زیرِ حکومت رہتے ہوں) یہ مذہب کی شکل میں موجود ہے۔ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک' پاکستان میں بھی!

اگرچہ اسلام کو اس کے نام لیواؤں نے (دانستہ یا نادانستہ) مذہب میں تبدیل کر دیا ہے، لیکن اس میں اور مذاہبِ عالم میں ایک بنیادی فرق ہے — اور یہی وہ فرق ہے جس سے کاروانِ انسانیت کو صحیح راستہ مل جانے کی اُمید ہو سکتی ہے۔ بلکہ یقینی ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ دینِ اسلام کا ضابطۂ قوانین — قرآنِ حکیم — اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں انسان کے پاس موجود ہے۔ لہٰذا یہ جب چاہیں اس مذہب کو پھر سے دین میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ہماری فرقوں میں بٹی ہوئی قوم کو، پھر سے ایک اُمّت بنانے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ کیا ہمارے صدرِ محترم یہ چیلنج قبول کریں گے؟

تمام اختلافات کے باوجود، مسلمانوں کے تمام فرقوں میں کم از کم ایک قدرِ مشترک موجود ہے اور وہ ہے اللہ کی کتاب — القرآن — جس پر سب کا ایمان ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ قرآن کو اپنے آئین اور قانون کی بنیاد قرار دیں۔ یہی رسول اللہ کی سنّت ہے۔ 'قرآن و سنّت' کی اصطلاح سے مُراد بھی یہی ہے کہ قرآن کا اتّباع کیا جائے کیونکہ یہی رسول اللہ کی بہترین سنّت ہے۔

قرآنِ حکیم نے بجز چند احکام، دین کے اصول و حدود مقرر کیے ہیں۔ اور اس بات کو اسلامی مملکت پر چھوڑا ہے کہ وہ، باہمی مشاورت سے، ان حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتّب کریں۔ قرآنی اصول و اقدار ہمیشہ غیر متبدّل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین میں عند الضرورت تبدیلی ہوتی رہے گی۔ اسی کا نام اسلامی نظامِ مملکت ہے۔ اسی نہج سے ایک ایسا آئین اور

ضابطہ، قوانین مرتّب ہو سکے گا۔ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ بھی ہو اور ہر زمانے میں ممکن العمل بھی۔ یہ ہے اسلام اور اسلامی نظام کا صحیح تصوّر جسے ہمیں قوم کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

اس تجویز کے خلاف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن حکیم تمام فرقوں میں مشترک ہے لیکن قرآن کی تعبیر ہر فرقہ کی اپنی اپنی ہے اسکا کیا علاج ہوگا؟ ایسا کہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ تعبیر کا اختلاف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب مختلف فرقوں کو تعبیر کا حق انفرادی طور پر دے دیا جائے۔ لیکن اگر یہی تعبیر اسلامی حکومت کی طرف سے ہو تو اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ قانون کے مقصد کے لئے اسلامی حکومت کی تعبیر سب کے نزدیک قابلِ قبول ہونی چاہیے۔ اس کے سوا نہ اسلامی حکومت کے قیام کی کوئی صورت ہو سکتی ہے نہ اسلامی قوانین کی ترتیب و اجراء کی کوئی شکل۔ اور نہ ہی اُمّت میں وحدتِ فکر و عمل کی کوئی صورت۔

حرفِ آخر

پاکستان کی بقا کا راز اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت میں ہے۔ لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ ہماری قوم ابھی تک ان نظریاتی سرحدوں کا تعین ہی نہیں کر سکی۔ اس سے دانستہ اغماض برتا جا رہا ہے۔ کیونکہ جب یہ حدیں واضح طور پر متعیّن ہو جائیں گی — یعنی نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعیّن ہو جائے گا۔ تو قوم کو ان حدود کے اندر رہنا پڑے گا۔ اور یہی چیز قوم کے مفاد پرست گروہوں پر سخت گراں گزرتی ہے۔ قوم کے اربابِ سیاست پر بھی اور عمائدِ مذہب پر بھی۔ یہ ہے وہ حقیقی علّت جس کی وجہ سے نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعیّن نہیں کیا جاتا۔ علّامہ اقبال کے الفاظ میں:۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے۔ تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کہیے!

نظریۂ پاکستان، قرآن کے دو لفظوں میں یہ ہے کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ رسولؐ اللہ سے کہا جا رہا ہے کہ "حکومت، اللہ کی کتاب کے مطابق قائم کرو" اور رسولؐ اللہ نے قائم کی۔

"بس یہ ہے نظریۂ پاکستان جس کی تشریح قائدِاعظمؒ نے ان جامع و مانع الفاظ میں فرمائی ہے۔

اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت و وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی، نہ کسی شخص یا ادارہ کی قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعیّن کرتے ہیں"

دوسرے الفاظ میں۔ اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔ جب ہم اللہ کی رسّی۔ القرآن

۔ کو مضبوطی سے تھام کر آگے بڑھیں گے تو غیر قرآنی نظریات و اعتقاد خود بخود دھڑام سے نیچے گرتے چلے جائیں گے۔

لیکن یہاں ہر گروہ، ہر پارٹی، ہر فرقہ، ہر حکومت نے اس نظریہ کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی اور اسی سے یہ چاروں طرف سے خطرات کے گرداب میں گھر گیا۔ اب اس کے تحفظ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس نظریہ کو قوم کا نصب العین حیات قرار دیا جائے اور ہمارا ہر عملی قدم اسی کی طرف اٹھے۔

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔

اعزاز الدین احمد خان
۷/۳۔ ای، لاہور کینٹ کواپریٹو
ہاؤسنگ سوسائٹی۔ لاہور چھاؤنی

۲۔ معاصر نوائے وقت کے ۱۷ فروری کے شمارے میں "قصہ ہاتھیوں کا" پڑھا۔ چند گذارشات پیشِ خدمت ہیں جن کے مطالعے سے قارئین شاید مستفید ہو سکیں۔

صاحب "تدبر قرآن" نے یہاں تک تو واضح کر دیا ہے کہ "تَرْمِيهِمْ" میں ضمیر کا مرجع قریش ہی ہیں ۔ ورنہ عموماً مرجع "طَيْرًا أَبَابِيلَ" کو ٹھہرا کر بات کسی اور طرف لے جائی جاتی تھی۔ اب یہ تو پتہ چل گیا کہ ابرہہ کی فوج پر سنگ باری قریش ہی نے کی تھی۔ الحمدللہ۔ دفاع کا جو طریق قریش نے اپنایا تھا۔ وہ ان دنوں بلکہ اب تک معروف ہے۔ تعداد اور اسلحہ میں کمزور ہونے کی وجہ سے قریش نے ریگولر افواج کی طرح سامنے آکر جم کر مقابلہ نہیں کیا۔ بلکہ گوریلوں کی طرح چھپ کر پہاڑوں کی بلندیوں میں دفاعی پوزیشن اختیار کر کے دشمن پر سخت پتھراؤ کیا۔ جس سے ابرہہ کی افواج کے لیے مکے تک پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ وہ راستے ہی سے شکست تسلیم کر کے واپس چلے گئے۔

أَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ کی تفسیر البتہ محلِ نظر ہے۔ اس مضمون میں ارشاد ہے" اللہ تعالیٰ نے اپنی حاصب (تندوتیز ہوا) کے ذریعے ان کی اس کمزور مدافعت کے اندر اتنی قوت پیدا کر دی کہ دشمن کھانے کے بھس کی طرح پامال ہو گئے"

بات تو بڑے مزے کی چل پڑی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی امداد اللہ تعالیٰ کے قوانین فطرت کے مطابق ہی ہوا کرتی ہے اس لیے یہ کہنا کہ ابابیلوں کی سنگ باری سے دشمن کو ہزیمت ہوئی، قرین قیاس نہیں کیونکہ یہ قانونِ فطرت کے مطابق نہیں۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ اب ذرا آگے چل کر یہ کہہ دیا جائے کہ حاصب (تندوتیز ہوا) جس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے، نے لشکرِ قریش کی مدد کی تو قریباً وہی بات ہو گی۔ جیسے کوئی کہے کہ ابابیلوں نے پتھر برسائے۔ میری رائے میں قرآن کریم میں بات اس طرح نہیں ہے۔

"طَيْرًا أَبَابِيلَ" کا کیا معاملہ ہے۔ اس کو یوں سمجھیے کہ سورۂ فیل کی آیت نمبر ۲ میں ہے کہ لشکر ابرہہ نے حملے کی ایک خفیہ تدبیر بنائی تھی (کیداً)۔ حملے کا جو راستہ اختیار کیا گیا وہ غیر مانوس تھا۔ آج کل کے الفاظ میں کہا جائے گا کہ

DIRECTION OF ATTACK کے معاملے میں SURPRISE دی گئی جو کہ ایک مانا ہوا جنگ کا اُصول ہے۔ اس راستے کا تعین اس طرح ہو گیا کہ ابابیل کے جھُنڈ کے جھُنڈ اس لشکر کے ساتھ ساتھ منڈلاتے چلے آ رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ کھانے کو ملے گا۔ یہ بھی اس زمانے میں لشکروں کے راستوں کا تعین کرنے کا ایک مسلّمہ طریقہ تھا۔ لہٰذا قریش کو جب معلوم ہو گیا کہ کس نامانوس راستے سے لشکر حملے کے لیے آ رہا ہے انہوں نے اسی مناسبت سے دفاعی پوزیشن اختیار کی اور حملہ آوروں کو مکّے تک پہنچنے سے پہلے ہی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

ضمناً اس مضمون میں غزوۂ بدر کا بھی ذکر چل گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ "نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر صرف مُٹھی بھر خاک قریش کے لشکر کی طرف پھینکی تھی۔ لیکن وہی مُٹھی بھر خاک اُن کے لیے طوفان بن گئی۔ یہ تو پھر اللہ کے قوانینِ فطرت کے خلاف بات چلی جاتی نظر آتی ہے۔ میری رائے میں بات یہاں بھی ایسی نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ رسول کریمؐ اور ان کے لشکر نے تیراندازی کی تھی (رمیت) قابلِ صد ستائش ہیں۔ رسول کریمؐ اور ان کے صحابیؓ کہ انہوں نے تعداد اور اسلحہ میں کمزور ہونے کے باوجود، مہارت اور استقلال کے ساتھ ایک نہایت اچھے انداز میں دفاع کر کے اپنے سے بڑے لشکر کو شکست دی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے قوانین کے مطابق ہوتا چلا آتا ہے۔

(کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً ..... ۲/۲۴۹)

حاصل کلام یہ ہوا کہ اَصْحٰبِ الْفِيْلِ کے موقع پر قریش کی جیت اور ابرہہ کی شکست مسلّمہ قوانینِ جنگ کے مطابق ہوئی اس میں معجزے کی کوئی بات نکالنا اور قریش کا جنگی مہارت اور ثبات و استقلال کے ساتھ دفاع کو تسلیم نہ کرنا قریش کے ساتھ زیادتی ہو گی۔

احسان الحق
میجر جنرل (ریٹائرڈ)

ضرورت رشتہ

قرآنی سیرت کی حامل BA پاس دوشیزہ کے لئے رشتہ درکار ہے۔
خط و کتابت بذریعہ والدین قابل ترجیح سمجھی جائے گی۔
م ش معرفت ادارہ طلوع اسلام